عالمی ادب سے انتخاب

کارل اور اینا



انتخاب اور ترجمہ
محمد سلیم الرحمٰن

کارل اور اینا

(منتخب ترجمے)

محمد سلیم الرحمٰن

کارل اور اینا

(منتخب تراجم)

محمد سلیم الرحمٰن

ISBN 969-8379-67-3

پہلی اشاعت: ۲۰۰۳ء

زیرِ اہتمام
آج کی کتابیں

کمپوزنگ: حمزہ گبول
صفحہ سازی: عامر انصاری

طباعت: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400
فون: 5213916 - 5650623 (92-21)
ای میل: aaj@citypresspk.com
انٹرنیٹ: www.citypresspk.com

ترتیب

عرض مترجم

افسانوں کا جو مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہے وہ کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں۔ اس میں شامل افسانے مختلف اوقات میں ترجمہ کیے گئے اور مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

اتنا ضرور ہے کہ ان میں کوئی افسانہ ایسا نہیں جو مجھے پسند نہ ہو یا جسے میں نے کسی مجبوری کے تحت اردو میں منتقل کیا ہو۔ صرف اِلسے آئخنگر کا افسانہ ایسی کتاب کے لیے ترجمہ کیا گیا تھا جسے آپ پیشہ ورانہ کارگزاری کے ذیل میں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ افسانہ مجھے اتنا پسند ہے کہ اسے پڑھتے ہی ترجمہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ اس لیے اسے بھی ایسا ترجمہ ہی سمجھیے جو شوق سے کیا گیا ہو۔

تراجم کی ایک افادیت تو ظاہر و باہر ہے۔ اگر یہ کام سلیقے سے کیا جائے تو زبان و ادب کوئی بھی ہو، اس کی ثروت میں کسی نہ کسی اعتبار سے اضافہ ہوگا۔ تمام قارئین سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ کسی دوسری زبان یا زبانوں پر اتنی ہی دسترس رکھتے ہوں گے جتنی اپنی زبان پر۔ اس اعتبار سے ترجمہ ادب کی خدمت بھی ہے اور قارئین کی بھی۔

ترجمہ ایک اور انداز سے بھی زبان پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اگر اصل سے قریب رہ کر ترجمہ کیا جائے تو زبان میں مختلف اسالیب کے رچنے بسنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ترجمہ اصل متن سے کیا گیا ہو، ترجمہ در ترجمہ نہ ہو۔ میں اس مجموعے کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تاہم افسانوں کو حتی الامکان احتیاط سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والے اس مجموعے سے محظوظ ہوں گے جس میں کئی طرح کے ذائقے موجود ہیں۔

محمد سلیم الرحمٰن

یوجین باربو

چھٹیوں کی آخری شام

یہ ان کی چھٹیوں کا آخری دن تھا۔ ان دونوں کی آپس میں کچھ چخ چخ ہوگئی تھی اور وہ سمجھ رہے تھے کہ اب انھیں ایک دوسرے سے محبت نہیں رہی۔ ریت انھیں سرد اور سمندر اجنبی لگنا چاہیے تھا، مگر انھوں نے ایسی کوئی بات محسوس نہ کی۔ اگست کے آخر کا وہ دن سمندر کنارے کی سیدھی کھڑی چٹان کے پیچھے کہیں دم توڑ رہا تھا۔ کبھی کبھار سمندری بگلے نندا سے انداز میں پر مارتے پاس سے گذر جاتے۔ ٹھنڈ بڑھ چلی تھی اور شام کی الکساتی ہوا جاگ رہی تھی۔ گلتی سڑتی پن جھاڑیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی، اور چپٹا سورج، دھند میں لپٹا ہوا، کسی مذبوح مویشی کی طرح قرمزی رنگ کا، یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اڑوس پڑوس کے ماہی گیری کے اڈوں کی چھت پر گر پڑا ہو۔ پتھر کی بنی ہوئی جیٹی سے دھند بھونپوؤں کی آواز آرہی تھی۔ وہ خواہ مخواہ ہُو ہُو کر رہے تھے کیوں کہ کوئی جہاز آتا دکھائی نہ دے رہا تھا اور آسمان گہرا اور صاف تھا۔

''ہم پھر سمندر میں اترنے لگے ہیں؟'' عورت نے مرد کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''ہاں،'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اس برس وہ آخری بار سمندر میں اترنے کو تھے۔

وہ اٹھی اور پیدل چلتی ہوئی سمندر میں جا اتری۔ ننھی ننھی لہریں، جنھیں ہوا نے بس ذرا سا اُبھارا ہی تھا، ان کے پیروں کو تھپتھپا رہی تھیں۔ ان دونوں کے لمبے سائے پانی پر پھیل گئے۔ وہ آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ مرد نے ربڑ کے بنے ہوئے فلیپر پہن لیے تھے۔ وہ ہمیشہ فلیپر پہن کر تیرا کرتا تھا۔ وہ عورت کے گرد چکر پہ چکر لگا کر اسے آگے بڑھتے دیکھتا رہا۔ ابھی صرف چند برس پہلے ہی کی تو بات تھی کہ عورت میں ڈباؤ پانی میں تیرنے کا حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ وہ سمندر سے ڈرتی تھی، لیکن یہ وقت اتنا سہانا تھا کہ کوئی اندیشہ باقی نہ رہا تھا۔ آج وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح نہیں دیکھ رہے تھے جس طرح کل تک دیکھتے رہے تھے۔ وہ کل کی طرح بلند آواز سے بول بول کر ایک دوسرے کا حوصلہ بھی نہیں بڑھا رہے تھے۔ مرد منھ

پھیلائے، فلیپروں کی مدد سے جلدی جلدی ہاتھ پیر مارتا سمندر میں بڑھتا جارہا تھا۔
پانی مخمل کی طرح ملائم، لبھاتا ہوا اور پراسرار تھا۔ گدلی ریتلی تہہ تک ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ چٹان چھوٹی ہوتی گئی۔ تارکول کی بو ابھی تک باقی تھی اور ماہی گیری کے اڈوں کے جال پیچھے رہ گئے تھے۔ مرد، پہلے کی طرح بے پروا، آگے بڑھے جانے پر تلا ہوا، عورت کے گرد اپنے دائروں کے گھیر کو چوڑا کرتا گیا۔ وہ چاق و چوبند محسوس کرر ہا تھا، اسے سکون مل رہا تھا۔ کئی بار وہ غوطہ مار کر تہہ تک گیا اور مچھلیوں کو ڈرا آیا جو ایسی لگتی تھیں جیسے ڈھیروں نیلے نیلے چاقو پانی میں پھینک دیے گئے ہیں۔ وہ کچھ دیر سیدھا لیٹا پانی پر تیرا کیا اور بے رنگ آسمان کو تکتا رہا۔ ایک پرندہ قریب سے گذرا اور اس کی ٹھنڈی برف جیسی نیلی آنکھوں نے اسے جس انداز سے دیکھا اس سے خصومت ٹپکتی تھی۔ ہوا تیز ہو چکی تھی کہ اس کا ہر شام یہی معمول تھا۔ مرد نے مڑ کر پیچھے نظر ڈالی۔ عورت آہستہ آہستہ آرام طلب انداز میں، مستانہ وار، ٹھیک اس کے سامنے تیر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مرد کے جی میں آیا کہ اس کا نام لے کر پکارے اور ہنسے: ''بس، بہت ہو گئی یہ لغویت۔ ہم بیکار میں ایک دوسرے سے الجھ پڑے!'' لیکن اس نے اپنا ارادہ بدل لیا اور پانی پر اس طرح لیٹ گیا جیسے وہ کوئی تکیہ ہو۔ سمندر کا سفید جھاگ کئی بار اس کی کھلی آنکھوں پر سے گذرا۔ سورج ماہی گیری کے اڈوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ ریت بھی نیلا ہو گیا تھا جیسے راکھ ہو۔ چونے دار پتھروں والے کنارے پر بہت اوپر کی طرف دو پیلے لیکر اس برس پہلی بار اپنی پتیاں جھاڑ رہے تھے۔ ہوا نرم اور شفاف تھی۔ وہ موت کے بارے میں، محبت کے بارے میں سرگوشیاں کررہی تھی۔ کسی تند و تیز شراب کے مانند تھی۔

تیرتے تیرتے وہ ساحل سے دور ہٹتے جارہے تھے۔ انھیں مطلق تھکن محسوس نہ ہوئی۔ سمندر میں دور نکل جانے پر ایسا لگا جیسے وقت زیادہ دھیرے دھیرے بیت رہا ہو۔ لائٹ ہاؤس اور جیٹی کے پتھر نظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔ یہاں سکوت گونجتا معلوم ہوتا تھا۔ کوئی بات سوچنا، کسی چیز کی آرزو کرنا ناممکن تھا۔ عورت کو عنقریب طاری ہونے والے خوف کے اوّلین آثار کا احساس ہوا۔ مرد اسے دکھائی تو دے رہا تھا مگر بہت فاصلے پر معلوم ہوتا تھا۔ ''اگر میرے بازو اَم گئے تو؟'' وہ گھبرا کر حیران سی ہوئی۔'' وہ ام کیوں جائیں، وہ بھی آج کے دن؟ تم تو پہلے بھی سمندر میں اتنی دور تک آچکی ہو۔'' وہ اب اپنی بات کا خود بھی جواب نہیں دے رہی تھی۔ اسے مرد پر تاؤ آرہا تھا کہ وہ اتنا ہٹیلا کیوں ہے، اور کچھ دیر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

ہوا اور بپھر گئی تھی۔ مغرب میں آسمان سرخ ہو چکا تھا۔ وہاں، چٹانوں کے اوپر، ایسا لگتا تھا ہر چیز کو آگ لگی ہوئی ہے۔ سمندر پر تنے آسمان میں ابھی ہاتھی دانت کے رنگ کی چند ایک بدلیاں باقی تھیں، جیسے کسی کیم شحیم مہا فیل کی پسلیاں۔ پانی ٹھنڈا تھا اور دھات کی طرح سخت معلوم ہو رہا تھا۔ ایک زیرِ آب رو قریب ہی چل رہی تھی۔

''ہماری شاید ڈولفنوں سے مڈھ بھیڑ ہوجائے،'' مرد نے سوچا۔ ''پھر وہ ڈر جائے گی اور مدد کے لیے مجھے پکارے گی۔'' لیکن کوئی ڈولفن ان کو نہ ملی۔ مچھلیوں کا ایک غول کا غول مرد کے پاس سے گذرا۔ وہ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے موجوں کی سفید کلغیوں تلے رو پہلا سمندری گارا بہا جا رہا ہو۔ مچھلیاں، کہ ہزاروں تھیں، عجیب انداز سے سائیں سائیں کرتی، لمبی لمبی، پھرتیلی جنبشوں کے ساتھ آگے بڑھتی گئیں۔

بیچ اب صرف ایک پتلی، پیلی دھجی نظر آ رہی تھی۔ پانی بھی اب دیکھنے میں سبز نہیں تھا؛ ڈھلے لوہے جیسا دکھائی دے رہا تھا؛ تکلیف دہ اور بوجھل بن گیا تھا۔ ''کیا ہم بہت دور نہیں نکل آئے؟'' مرد نے حیران ہو کر سوچا اور پانی سے اچھل کر باہر آنے کے بعد غوطہ لگایا۔ لہریں اب قدرے بڑی ہوگئی تھیں۔ اور اس کی نظر عورت پر جا پڑی۔ وہ خاصی قریب معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ بازو سر سے اوپر لے جا کر عورت کو اشارہ کرے لیکن ایک بار پھر اس نے ارادہ بدل لیا۔ اس نے عورت کے گرد اور بھی بڑا چکر کاٹا۔ ربڑ کے فلیپروں کے سبب اس کے لیے تیراکی آسان اور کہیں زیادہ پر لطف ہوگئی تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے لہروں کو چیرتا آگے بڑھتا گیا، اور ارد گرد دیکھنا چھوڑ دیا۔ کھلے سمندر کا پانی ساحل کے قریب کے پانی سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ دفعتاً اپنا سارا رنگ کھو بیٹھتا ہے۔ بے کراں نظر آتا ہے۔ اور اس میں کوئی بو نہیں ہوتی۔ وہ اس طرح جی اٹھتا ہے جیسے کوئی زندہ چیز ہو۔ گرم محسوس ہوتا ہے اور بولنے لگتا ہے۔

لہریں بڑی ہوتی جا رہی تھیں اور چاروں طرف سے اُمڈی آتی تھیں۔ وہ مکار تھیں۔ صرف سمندر ہی اتنا مکار ہو سکتا ہے۔ جھاگ مرد کے ماتھے پر، بالوں پر، پھیل پھیل گیا۔ جھاگ اس کے نتھنوں اور منہ میں چلا گیا۔ بعض اوقات پانی آ کر یوں لگتا جیسے باڑھ دار تلوار ہو۔ پانی نے اسے تکلیف پہنچائی اور وہ جلن محسوس کرنے لگا۔

عورت کو یوں لگا جیسے وہ برابر ڈوبتی ہی چلی جا رہی ہو۔ لیکن یہ کیفیت اسے ہمیشہ بھلی لگتی تھی۔ اس کا جی یونہی ذرا سا متلایا تو وہ مرد کی تلاش میں نظر دوڑانے پر مجبور ہوگئی۔ اب وہ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سطح آب سے اوپر اٹھ آئی مگر اسے نہ دیکھ پائی۔ اسے یہ تو کبھی پتا ہی نہ چلا تھا کہ وہ ہے کہاں کیوں کہ وہ سارے وقت اس کا طواف کرتا رہا تھا۔ وہ فکر مند نہیں ہوئی۔ وہ یقیناً کہیں آس پاس ہی ہوگا۔ ذرا دیر میں وہ اس کے سامنے سے گزرے گا۔ وہ تیرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی اور خوش تھی کہ اسے تھکن محسوس نہیں ہو رہی۔ ایک وقت تھا جب وہ کھلے سمندر سے ڈرتی تھی لیکن جب ایک بار اس ڈر پر فتح پا لی جائے تو کھلا سمندر دوست بن جاتا ہے اور اس پر پیار آنے لگتا ہے۔

آسمان نے سمندر کا رنگ چرا لیا تھا۔ وہ سبزی مائل اور گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان تلے پھوکی لچھیوں جیسی بدلیاں اڑی جا رہی تھیں اور ساحل نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ آسمان اور پانی کے بیچوں بیچ

تھے۔ اس طرح سیدھے پڑے پڑے تعجب اس پہ آتا ہے کہ آدمی اس بے قرار سطح پر سے کہیں اور جا کر گرتا ہی نہیں۔ ساحل کے قریب کی لہروں سے کچے تربوزوں کی سی باس آتی تھی۔ لیکن یہاں یہ لہریں ذائقے اور گرماہٹ دونوں سے محروم ہو چکی تھیں۔

مرد نے پانی سے اٹھ کر سمندر پر نظر ڈالی۔ پانی میں کوئی بھی نہیں تھا۔

اس نے دوبارہ غوطہ مارا۔ کانوں پر گہرے پانی کا سُن کر دینے والا دباؤ محسوس کیا۔ وہ تڑپ کر پانی سے باہر آیا اور دوبارہ پانی میں جا گرنے سے پہلے پل بھر کے لیے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں سمندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

عورت نے اپنی نظر دائیں طرف گھمائی، پھر بائیں طرف، مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ سمندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ پکارنے لگی۔

مرد نے ایک بار اور غوطہ لگایا، پھر سُو نے سمندر پر نگاہ ڈالی اور پکارنے لگا۔

سمندر یوں لگتا تھا جیسے ابل رہا ہو۔ یہاں اگست کے اواخر کی سہانی روشنی میں سمندر اکیلا اور بلوان تھا اور ٹھس آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ خاموشی کافور ہو چکی تھی۔ سمندر گرجا۔ مرد نے دائرے کو چھوٹا کرتے ہوئے تیز تیز تیرنا شروع کر دیا۔ ''وہ یقیناً یہیں کہیں ہوگی، یہ طے ہے۔'' زور مارنے کی وجہ سے اس کی بانہیں دُکھنے لگیں۔ اس نے آواز دی۔ کوئی جواب نہیں۔

عورت نے ایک بار پھر اوپر اٹھ کر سمندر پر نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے زور سے آواز دی۔ ایک سمندری بگلا اسے سرد مہر، نیلی، خشم آلود آنکھوں سے دیکھتا ہوا گذرا۔ وہ اکیلی تھی۔ وہ چلائی۔ کوئی جواب نہیں۔ ''میں کہاں چلی جا رہی ہوں؟'' وہ اچانک سہم کر حیران ہوئی۔ ''مجھے ساحل کا رخ کرنا چاہیے۔''

اور وہ ساحل کی طرف مڑ گئی۔ لیکن خوف زدہ تھی۔ ''فرض کرو وہ ڈوب گیا ہے!''

''وہ ڈوب نہیں سکتا! وہ بہت اچھا تیراک ہے!''

''کہیں وہ؟''

''نہیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا!''

اس نے پھر سمندر سے ابھر کر آواز دی۔ کوئی جواب نہیں۔

مرد نے پھر غوطہ مارا اور خود کو پانی پر چت ہو جانے دیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سکوت میں ڈوبا سمندر سیاہ اور سفاک معلوم ہو رہا تھا۔ یک بیک ہوا تھم گئی اور ارد گرد

موجیں، کسی اترے لبادے کی طرح، بے جان ہو کر، ڈھیر ہو گئیں۔ اس نے آواز دی۔ کوئی جواب نہیں۔

لائٹ ہاؤس اور کنارہ اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ ''مجھے واپس جانا چاہیے،'' اس نے خود سے کہا۔

''اور جو وہ ڈوب گئی ہو؟''

''نہیں، یہ ممکن نہیں۔''

''کہیں وہ پانی سے ڈر نہ گئی ہو؟''

''اب اسے پانی سے ڈر کہاں لگتا ہے۔''

مرد نے دوبارہ ابھر کر آواز دی۔ کوئی جواب نہیں۔

پھر وہ رونے اور زور زور سے چیخنے لگا، جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہو۔

''تم نے اسے اکیلی کیوں چھوڑ دیا؟ تم نے اسے اکیلی کیوں چھوڑ دیا؟''

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ سمندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سمندر اب پر سکون تھا۔ وہ اسفالٹ جیسا تھا اور بے اعتنائی سے غوں غاں کر رہا تھا۔

''اگر اسے میری مدد کی ضرورت پڑی اور میں اس کے پاس نہ ہوا تو؟ میں کس منھ سے واپس جا سکتا ہوں؟''

اسے یوں لگا جیسے عورت کی آواز سنائی دی اور وہ دوبارہ پانی سے ابھر آیا۔ اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔

عورت روتی ہوئی، گرتی پڑتی، ساحل کی طرف بڑھتی رہی۔ اس نے پانی سے سر باہر نکال کر، گلے کا پورا زور لگا کر، آواز دی، مگر کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ ''اگر وہ ڈوب گیا ہے تو میں لوٹ آؤں گی،'' اس نے فیصلہ کیا۔

''شاید وہ مجھے ڈرانا چاہتا تھا... فرض کرو وہ ساحل پر مجھے نہیں ملتا؟'' خوف نے اس کا گلا جکڑ لیا اور اسے کہیں جلدی تھکا مارا۔

مرد نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ ساحل پر نہ ملی تو وہ لوٹ آئے گا۔

اور وہ رات ہونے تک روتے ہوئے اور ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے تیرتے رہے۔ پھر، تھکن سے چُور، وہ بیچ پر ایک دوسرے سے آ ملے، جہاں اب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

ہیوگو فان ہوفمنسٹال

آگ کے رنگ

ایک زمانے میں، جب میں برسرِ روزگار تھا، مجھے ہر ہفتے خاصی باقاعدگی سے کئی کئی بار، ٹھیک ایک ہی وقت پر ایک چھوٹے پُل سے گزرنا پڑتا (اس وقت تک پوں نیوف نامی پُل نہیں بنا تھا) اور وہاں آتے جاتے رہنے کی وجہ سے بعض مزدور اور دوسرے عام لوگ مجھے پہچاننے اور سلام کرنے لگے۔ مگر ایک بہت خوبرو بساطن، جس کی دکان پر دو فرشتوں کا نشان بنا ہوا تھا، سب سے زیادہ باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ سلام کرتی۔ ان پانچ چھ مہینوں کے دوران میں جب میں اِدھر سے گزرتا وہ جھک کر آداب بجالاتی اور جب تک میں نظر سے اوجھل نہ ہو جاتا مجھے دیکھتی رہتی۔ اس طرزِ عمل سے میں اس کی طرف مائل ہو کر اس سے نظر ملانے اور تسلیمات کا جواب دینے کا خیال رکھنے لگا۔

ایک مرتبہ میں موسمِ سرما کے آخر میں گھوڑے پر سوار فونتین بلو سے پیرس آ رہا تھا، اور جب میں نے گھوڑا پل پر چڑھایا تو وہ اپنی دکان کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور میں پاس سے گزرا تو بولی، ''آپ کی خادمہ، جناب عالی۔'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور کئی بار مڑ کر دیکھنے سے مجھے پتا چلا کہ وہ دروازے سے مزید باہر کو جھکی ہوئی ہے تاکہ جب تک ممکن ہو مجھے دیکھتی ہی رہے۔ میرے پیچھے میرا نوکر اور گھڑ سوار کوچوان تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ بعض خواتین کے نام خط دے کر کوچوان کو اسی شام واپس فونتین بلو بھیج دوں گا۔ میں نے حکم دیا تو نوکر گھوڑے سے اتر کر نوجوان عورت کے پاس گیا اور میری طرف سے اس سے کہا کہ میں ملاحظہ کر چکا ہوں کہ وہ مجھے دیکھنے اور سلام کرنے کا کتنا اشتیاق رکھتی ہے اور یہ کہ اگر وہ مجھ سے زیادہ قریبی تعلقات قائم کرنے کی آرزومند ہے تو کوئی جگہ تجویز کر دے اور میں وہاں حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔

اس نے میرے نوکر کو جواب دیا، ''اس سے زیادہ خوشگوار پیام اور کیا ہوگا جو تم نے پہنچایا ہے۔ میں خود تمھارے صاحب کی چنی ہوئی کسی جگہ آنے کو تیار ہوں۔''

جب ہم آگے بڑھ گئے تو میں نے نوکر سے پوچھا کہ اسے کسی ایسی جگہ کا پتا ہے جہاں میں اس عورت سے مل سکوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں اسے فلانی کٹنی کے گھر لے جاسکتا ہوں۔ مگر میرا یہ نوکر، ولیم نامی، کورترائی کا رہنے والا، بہت ہی محتاط اور بااصول شخص واقع ہوا تھا اور اس نے فوراً یہ بھی کہا کہ شہر میں کہیں کہیں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور مرنے والوں میں چوں کہ کم اصل اور غلیظ مردوں عورتوں کے علاوہ ایک طبیب اور ایک بڑا پادری بھی شامل ہے اس لیے وہ یہ مشورہ دے گا کہ میں اپنی چادریں اور گدّے ساتھ لے جاؤں۔ میں نے اس کی تجویز مان لی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے بستر اچھی طرح بچھادے گا۔ گھوڑے سے اترنے سے پہلے میں نے مزید کہا کہ وہ اس جگہ ایک ٹھیک ٹھاک سلفچی، تیز خوشبو والے عطر کی چھوٹی شیشی، چند ایک کیک اور سیب بھی لے جائے اور کمرے کو خوب اچھی طرح گرم کر دینے کا خیال بھی رکھے کیوں کہ جاڑا اتنا پڑ رہا تھا کہ میرے پاؤں رکابوں میں اکڑ کر رہ گئے تھے اور آسمان پر برفانی بادل چھائے ہوئے تھے۔

اس شام جب میں مقررہ مقام پر پہنچا تو میں نے ایک بہت حسین نوجوان عورت کو، جو کوئی بیس برس کی ہوگی، بستر پر بیٹھا پایا اور کٹنی اپنے سر اور جھکی ہوئی کمر کو کالی شال میں لپیٹے بظاہر اسے کسی بات پر اکسا رہی تھی۔ دروازہ نیم وا تھا اور آتش دان میں بڑے بڑے تازہ کٹے لٹھے دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ عورتوں نے میری آہٹ نہ سنی اور میں لحہ بھر دروازے میں کھڑا رہا۔ نوجوان عورت کی چوڑی کھلی ہوئی آنکھیں آگ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے سر کی ایک ہی جنبش سے یوں لگا جیسے اس کے اور بڑھیا ڈھڈو کے درمیان کالے کوس حائل ہو گئے ہوں۔ اس جنبش سے شب خوابی کی چھوٹی سی ٹوپی سے گھنے کالے بالوں کی چند لٹیں باہر نکل آئیں اور فطری گھونگھروں میں بل کھاتی ہوئی شانے اور سینے کے درمیان کُرتی پر بکھر گئیں۔ اس نے سبز اونی کپڑے کا چھوٹا سا پیٹی کوٹ اور پاؤں میں چپل بھی پہن رکھے تھے۔

اس لمحے ضرور میں نے کسی آہٹ سے اپنی وہاں موجودگی ان پر ظاہر کر دی۔ اس نے سر کو یک لخت حرکت دے کر جو چہرہ میری طرف کیا اس پر انتظار کی وجہ سے ایسی وحشت چھائی ہوئی تھی کہ تند خوئی کا گمان ہوسکتا تھا۔ مگر پرستاری کی اس تجلّی نے جو اس کی چوڑی کھلی آنکھوں سے پھوٹ اور سکوت زدہ لبوں سے کسی غیر مرئی شعلے کی طرح لپک رہی تھی، اس گمان کو دور کر دیا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ بڑھیا کو فی الفور کمرے سے دفان کر دیا گیا اور میں اپنی معشوقہ کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ جب میں نے، یہ غیر مترقبہ دولت ہاتھ آنے کی سرخوشی میں، چند ایک گستاخیاں کرنے کی جسارت کی تو وہ اپنے بشرے اور لطیف دھیمی آواز سے ناقابل بیان طور پر اضطراب آمیز التجا کرتی ہوئی جھجک کر مجھ سے دور ہٹ گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی بانہیں پھر میرے گرد تھیں اور اس کی اوپر کو دیکھتی ہوئی اتھاہ آنکھوں نے، جو مجھ پر دباؤ ڈال رہی

تھیں، مجھے اس زور سے گرفت میں لے لیا کہ اس کے ہونٹ اور بانہیں بھی اتنے زور سے نہ بھینچ سکی تھیں۔ پھر ایسا لگا جیسے وہ دوبارہ کچھ کہنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہو، لیکن اس کے بوسوں سے تھرتھراتے ہونٹوں پر کوئی لفظ نہ آیا اور مرتعش گلو سے ٹوٹی پھوٹی سسکی سے زیادہ واضح کوئی صدا نہ نکلی۔

اب سنیے کہ میں نے دن کا بیشتر حصہ منجمد شاہراہوں پر سواری کرنے میں گزارا تھا۔ بعدازاں میں نے شاہی محل کے پیش دالان میں ایک بہت ہی ناگوار اور پُرتشدد منظر میں حصہ لیا تھا اور پھر بدمزگی دور کرنے کے لیے شراب پی تھی اور بڑے زور شور سے دودستی تیغ زنی کی مشق کی تھی۔ چناں چہ اس دلکش اور پُراسرار جوکھم کے دوران، جب میں اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ ملائم بانہیں میرے گلے میں حمائل تھیں اور معطر بال مجھ پر بکھرے ہوئے تھے، تقریباً بے ہوشی سے مشابہ تھکان مجھ پر غالب آ گئی۔ تھکان اتنی اچانک اور مکمل طور پر حاوی آ جانے والی تھی کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں اس کمرے تک پہنچا کیسے تھا؛ بلکہ ایک لمحے کے لیے تو میں اس عورت کو، جس کا دل میرے دل کے اتنے قریب دھڑک رہا تھا، ایک بالکل ہی دوسری عورت سمجھ بیٹھا جس سے میں پہلے کبھی واقف تھا، اور آن کی آن میں گہری نیند سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا بدستور طاری تھا لیکن میں نے فوراً محسوس کیا کہ میری معشوقہ پہلو میں نہ تھی۔ میں نے سر اٹھایا اور بجھتے ہوئے انگاروں کی مدھم روشنی میں اسے کھڑکی کے قریب کھڑے دیکھا۔ اس نے ایک جھلملی کھول دی تھی اور اس میں سے باہر جھانک رہی تھی۔ پھر وہ مڑی، اس نے دیکھا کہ میں جاگ گیا ہوں، اور کہا، (میں آج بھی چشمِ تصور میں اسے گرے ہوئے بالوں کو ہٹانے کے لیے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی رخسار تک لاتے دیکھ سکتا ہوں) ''ابھی سویرا نہیں ہوا، بہت دیر تک نہ ہوگا۔'' صرف اس وقت مجھے واقعی پتا چلا کہ وہ کتنی بلند قامت اور خوب صورت ہے۔ میرے لیے یہ انتظار بھی مشکل ہو گیا کہ وہ اپنے خوش نما، دہک سے لال پانوؤں سے ایک یا دو لمبے، اَڈول قدم بھر کر میرے پہلو میں آ جائے۔ آتے آتے وہ آتش دان تک گئی، نیچے جھکی، سامنے پڑے ہوئے آخری بھاری لٹھے کو چمکیلی ننگی بانہوں میں اٹھایا اور انگاروں پر پھینک دیا۔ پھر وہ میری طرف مڑی۔ اس کا چہرہ شادمانی اور شعلوں سے جگمگا رہا تھا۔ گزرتے گزرتے اس نے میز پر سے ایک سیب اٹھایا اور پھر میری بانہوں میں آ گئی۔ اس کے اعضا میں ابھی آگ کی تازہ حرارت رچی ہوئی تھی اور اگلے لمحے وہ گویا ان کہیں زیادہ تند شعلوں میں پگھل گئے جو اس کے بدن میں رواں دواں تھے۔ دائیں ہاتھ سے مجھے تھام کر، اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑے سیب میں دانت گڑو دیے۔ پھر اسے میرے منہ کی طرف یوں بڑھایا جیسے پھل پیش کر رہی ہو، اپنا چہرہ پیش کر رہی ہو۔ آتش دان میں پڑے آخری لٹھے سے اتنے اونچے شعلے اٹھے کہ باقی لٹھے مات ہو گئے۔ چنگاریوں کی بوچھاڑ کے ساتھ لٹھے نے شعلوں کو اندر کھینچا اور پھر انھیں تند لپٹ کی شکل میں اُگل دیا اور آتش دان کی روشنی ہم پر اس طرح پھیلی جیسے کوئی موج

دیوار سے ٹکرا رہی ہو، اور ہماری ہم آغوشی کا سایہ دیوار پر جھونٹے کھانے لگا۔ بڑا الٹھا چٹخا، اس نے اپنے دل سے تازہ شعلوں کو پروان چڑھایا، جو ناچتے ہوئے اوپر اٹھتے گئے اور دہکتی ہوئی لالی کے فواروں اور طوماروں سے ظلمت کو فرو کر دیا۔ پھر یکایک آگ سرد پڑ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے سانس نے، کسی ہاتھ کی طرح، جھلملی کھول کر، نیلوں سے داغ داغ صبح کے بھیانک بھورے پن کو آشکار کر دیا۔

یہ جان کر کہ دن آ پہنچا ہے، ہم اٹھ بیٹھے۔ مگر باہر جو اجالا تھا وہ دن جیسا نہ تھا۔ یہ دنیا کی بیداری نہ تھی اور مکان سے باہر جو چیز تھی وہ سڑک جیسی نہ تھی۔ چیزوں کے بیرونی خطوط معدوم تھے۔ یہ ایسی کائنات تھی جس کی کوئی شکل نہ تھی، جو خالی تھی، جہاں صرف بے شکل اور لازماں چیزیں چل پھر سکتی تھیں۔ کہیں دور سے، کسی یاد کی طرح، گرجا کے گھنٹے کی ٹن ٹن سنائی دی اور ایک سیلی سیلی ہوا، جس کا دن میں کوئی ٹھکانا تھا نہ رات میں، کمرے میں آنے لگی حتیٰ کہ ہم دونوں کانپتے ہوئے ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ وہ پیچھے کو جھکی، اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ اس کا گلا تھرتھرایا، کوئی چیز اس کے اندر اُبھری، ہونٹوں تک امنڈ آئی، مگر کوئی لفظ ادا نہ ہوا، کوئی آہ نہ نکلی، کوئی بوسہ نہ لیا گیا، بلکہ وہ کوئی ایسی چیز تھی جو، نازائیدہ، ان تینوں سے مشابہ تھی۔ بڑھتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے پر دوڑنے والی بدلتی کیفیات پہلے سے بھی زیادہ کچھ کہتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اچانک، باہر سڑک پر گھسٹتے قدموں کی چاپ اور بولنے چالنے کی آوازیں کھڑکی کے اتنے قریب آتی گئیں کہ اس نے جھک کر اپنا منھ دیوار کی طرف موڑ لیا۔ دو آدمی گزرے۔ ان میں سے ایک نے جو چھوٹی سی لالٹین اٹھا رکھی تھی اس کی روشنی سے لمحے بھر کو کمرے میں اجالا ہو گیا۔ دوسرا آدمی ایک ٹھیلا دھکیل رہا تھا جس کے پہیے بوجھ کے مارے چوں چوں کر رہے تھے۔ جب آدمی گزر گئے تو میں نے اٹھ کر جھلملی بند کر دی اور موم بتی جلائی۔ ادھ کھایا سیب ابھی وہیں پڑا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اسے کھا لیا اور پھر میں نے پوچھا کہ کیا اس سے ایک بار اور ملنا ممکن ہے، کیوں کہ مجھے اتوار تک قیام کرنا تھا اور گزری رات جمعرات اور جمعے کی درمیانی رات تھی۔

اس نے جواب دیا کہ وہ یقیناً دوبارہ ملنے کی مجھ سے بھی زیادہ گرم جوشی سے متمنی ہے لیکن اگر میں اتوار کے بعد تک نہ ٹھیر سکا تو وہ مجھ سے نہ مل سکے گی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے صرف اتوار اور پیر کی درمیانی رات کو مل سکتی تھی۔

معاً مجھے کئی رکاوٹوں کا خیال آیا اور میں نے کوئی عذر کیا جسے وہ بغیر کچھ کہے سنتی رہی، مگر اس کی آنکھوں میں انتہائی دردناک سوالی کیفیت تھی اور چہرے کی مغموم روشنی تقریباً بھیانک نظر آنے لگی تھی۔ اس کے بعد، ظاہر ہے، مجھے اتوار کے بعد تک ٹھیرنے کا وعدہ کرتے ہی بنی اور میں نے مزید کہا کہ اتوار کی شام کو اسی جگہ آ جاؤں گا۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی اور بالکل کرخت اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی، "مجھے

بخوبی علم ہے کہ میں نے تمھاری خاطر اس قحبہ خانے میں قدم رکھا ہے، مگر اس میں میری مرضی شامل تھی کیوں کہ میں تمھارے پاس آنا چاہتی تھی، کیوں کہ میں کہیں بھی جانے اور کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ لیکن اب اگر میں نے خود کو دوبارہ یہاں آنے پر آمادہ کیا تو اپنے آپ کو شہر کی سب سے ادنیٰ اور ذلیل ترین عورت تصور کروں گی۔ میں یہاں تمھاری خاطر آئی کہ میری نظر میں تم وہ سب کچھ ہو جو تم ہو، تم باسوم پیئر ہو، کہ دنیا میں تم ہی وہ واحد انسان ہو جس کی موجودگی اس گھر کو میری عزت آبرو کا گھر بنا سکتی تھی۔''

اس نے ''گھر'' کہا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے وہ کوئی زیادہ پُر حقارت لفظ کہنے والی تھی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے دیواروں پر، پلنگ پر، بستر پر، جو پھسل کر نیچے گر گیا تھا، ایسی نگاہ ڈالی کہ، اس کی آنکھوں سے کوندنے والی روشنی کے انبار تلے، وہ تمام کم اصل اور بدصورت چیزیں یوں معلوم ہوئیں جیسے ہڑ بڑا کر، دم دبائے، اس سے دور بھاگ رہی ہوں، جیسے بدحال کمرا ایک لمحے کے لیے سچ مچ بڑا ہو گیا ہو۔

پھر اس نے ایسی آواز میں، جس کی ملائمت اور وقار بیان نہیں ہو سکتا، کہا، ''کاش کہ مجھے ذلت کی موت نصیب ہو اگر میں تمھارے یا اپنے شوہر کے سوا کسی مرد سے آشنا ہوئی ہوں یا میں نے اس دنیا میں کسی اور کی خواہش کی ہو۔'' اور ذرا سا آگے جھک کر، واہونٹوں کے تنفس میں اپنی ساری جان سموئے، گویا کسی جواب کی، میری طرف سے وفا کیشی کی کسی یقین دہانی کی، منتظر دکھائی دی۔ لیکن چوں کہ اسے میرے چہرے پر وہ جذبہ نظر نہ آیا جس کی اسے جستجو تھی، اس کی اشتیاق بھری، متلاشی صورت پر اداسی چھا گئی، اس کی پلکیں گریں اور اٹھیں اور چشم زدن میں وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس نے اپنا ماتھا پورے زور سے جھلملی پر ٹیک رکھا تھا، اس کا سارا بدن بے صدا لیکن ہول ناک طور پر ہیجانی اشک باری سے اس طرح لرز رہا تھا کہ میری گویائی سلب ہو گئی اور میں اسے چھونے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کے دونوں ہاتھ بے جان سے ہو کر ڈھیلے لٹک رہے تھے۔ آخر کار میں نے اس کا ایک ہاتھ تھام لیا اور انتہائی پیار اور لگاؤ ظاہر کرنے والے جو جو لفظ مجھے آتے تھے بول کر، طویل کوشش کے بعد، اسے تسلی دینے میں کامیاب ہو گیا، یہاں تک کہ اس نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ پھر میری طرف کر دیا اور مسکراہٹ روشنی کی طرح اس کی آنکھوں سے امنڈی اور ہونٹوں کے اردگرد کھیلنے لگی جس سے اس کے آنسو فی الفور خشک ہو گئے اور سارا چہرہ جگمگا اٹھا۔

وہ کیا ہی مزے دار تماشا تھا جب اس نے ایک ہی موضوع کو ان گنت بار طرز بدل بدل کر بیان کرتے ہوئے، مجھ سے دوبارہ گفتگو شروع کی، ''تم مجھ سے دوبارہ ملو گے۔ پھر میں تمھیں اپنی چچی کے گھر میں بلالوں گی۔'' اور اس نے پہلے جملے کو درجن بھر مختلف انداز سے ادا کیا، کبھی شیریں اصرار سے، کبھی جھوٹ موٹ طفلانہ بدگمانی دکھا کر، کبھی کان میں اس طرح سرگوشی کر کے جیسے وہ جملہ دنیا کا عظیم ترین راز

ہو، کبھی گردن ذرا موڑ کے، کندھے جھٹک کے اور ہونٹ لٹکا کر جیسے ملاقات کا یہ وعدہ انتہائی معمولی بات ہو، اور آخر میں مجھ سے چمٹ کر، منھ اٹھا کر، کھلکھلاتے ہوے، چمکار بھرے لہجے میں۔ اس نے چچی کے مکان کی لمبی چوڑی تفصیل مجھے اس طرح بتائی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو، جسے پہلی مرتبہ نانبائی کی دکان تک اکیلے جانا پڑ رہا ہو، سڑک پار کرنے کا طریقہ سمجھا رہی ہو۔ پھر وہ تن کر کھڑی ہوگئی، سنجیدہ نظر آنے لگی، اور اپنی چمکیلی آنکھیں اس شدت سے مجھ پر جمادیں کہ ان کے دیکھے سے مردے بھی جی اٹھتے، اور کہنے لگی، ''میں دس بجے سے آدھی رات تک تمھارا انتظار کروں گی، بلکہ آدھی رات کے بعد تک، بلکہ اَور بھی بعد تک، اور زینے کی طرف کھلنے والا دروازہ کھلا رہے گا۔ پہلے ایک چھوٹی غلام گردش آئے گی۔ تم وہاں ہرگز نہ رکنا کیوں کہ میری چچی کے کمرے کا دروازہ وہیں کھلتا ہے۔ پھر تمھیں کوٹھے کا زینہ ملے گا، اور میں وہیں موجود ہوں گی۔'' اور پھر اس نے آنکھیں اس طرح موند لیں جیسے وہ چندھیا گئی ہوں، سر جھٹک کر پیچھے کیا اور بانہیں پھیلا کر مجھے آغوش میں لے لیا... اور لمحہ بھر بعد، پوری طرح ملبوس، عجیب اور سنجیدہ سی، میری آغوش سے، کمرے سے، نکل کر چلی گئی کہ دن چڑھ چکا تھا۔

میں نے روانگی کی تیاری کی، چند نوکروں کو سامان دے کر آگے بھیج دیا۔ اگلے دن شام کو مجھے ایسی شدید بےچینی نے ستایا کہ شام کی نماز کی گھنٹیاں بجے دیر نہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے نوکر ولیم کے ہمراہ وہ چھوٹا پل پار کیا۔ ولیم کو میں نے لالٹین ساتھ رکھنے کی ممانعت کردی تھی تاکہ میں اپنی محبوبہ سے اس کی دکان یا کسی قریبی مکان میں مل سکوں۔ اور کچھ نہیں تو اپنی موجودگی کا کوئی اتا پتا ہی دے سکوں، گو مجھے اس کے سوا کوئی امید نہ تھی کہ شاید اس سے ایک دو باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔

لوگوں کی توجہ سے بچنے کے لیے میں پل پر ٹھیر گیا اور موقعے کی دیکھ بھال کے لیے نوکر کو آگے چلتا کیا۔ وہ کچھ دیر غائب رہا، اور جب لوٹا تو چہرے سے وہی ملال اور مایوسی ظاہر تھی جس کے معنی ہمیشہ یہ ہوتے تھے کہ وہ میرا حکم بجالانے سے قاصر رہا۔ اس نے کہا، ''دکان تو بند ہے اور معلوم ہوتا ہے اندر کوئی ہے بھی نہیں۔ سچ پوچھیے تو سڑک سے ملے ہوے کمروں میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا، نہ کسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ صحن میں پہنچنے کے لیے ایک اونچی دیوار پر چڑھنا ہوگا اور اندر ایک بڑا سا کتا غرا رہا ہے۔ لیکن اگلے کمروں میں سے ایک میں روشنی جل رہی ہے اور ایک رخنے سے دکان میں جھانکنا ممکن ہے، گو میں سمجھتا ہوں کہ وہ خالی پڑی ہے۔''

یہ سن کر میرا ولولہ سرد ہوگیا اور میں نے فوراً گھر کی راہ لینے کا تہیہ کرلیا۔ اس کے باوجود میں بہت ہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا مکان کے سامنے سے دوبارہ گزرا اور میرے نوکر نے، اشتیاق کے مارے، رخنے سے جھانکا جس سے روشنی کی باریک لکیر باہر آرہی تھی اور زیرِلب مجھے بتایا کہ عورت تو دکان میں نہیں مگر اس

کا شوہر ہے۔ میں دکان دار کو دیکھنے کے لیے مضطرب تھا۔ مجھے یاد نہ آرہا تھا کہ اسے کبھی دکان پر دیکھا ہو اور کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ وہ موٹا اور بے ہنگم ہوگا اور کبھی یہ خیال آتا تھا کہ سوکھا ساکھا اور بڈھا پھوس ہوگا۔ جب میں رخنے کے پاس گیا تو یہ دیکھ کر میرے تحیر کی انتہا نہ رہی کہ اس آراستہ پیراستہ اور چوبی حاشیوں والے کمرے میں ایک غیر معمولی طور پر قد آور اور اچھی کاٹھی کا مرد ٹہل رہا تھا جو بلاشبہ مجھ سے سَر بھر اونچا تھا اور جب اس نے میری طرف منھ کیا تو مجھے ایک بہت سنجیدہ چہرہ نظر آیا۔ اس کی بھوری داڑھی میں کہیں کہیں سفید بال آگئے تھے، پیشانی تقریباً نادر رفعت کی حامل تھی اور اتنی کشادہ کنپٹیاں پہلے میں نے کسی انسان کی نہ دیکھی تھیں۔ اگرچہ وہ کمرے میں بالکل تنہا تھا، اس کی آنکھوں کو قرار نہ تھا، ہونٹ ہل رہے تھے، اور جب وہ ٹہلتے ٹہلتے وقتاً فوقتاً رک کر کھڑا ہو جاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی سے خیالی گفتگو میں مصروف ہے۔ ایک دفعہ اس نے ہاتھ ہلا کر اشارہ بھی کیا جیسے کسی اعتراض کو نیم شفقت آمیز تحکم کے ساتھ رد کر رہا ہو۔ اس کی حرکت سے سہل انگاری اور تقریباً تحقیر آمیز نخوت نمایاں تھی اور اسے کمرے میں اکیلے چہل قدمی کرتے دیکھ کر میں ایک بہت نامی گرامی قیدی کو واضح طور پر یاد کیے بغیر نہ رہ سکا جو بلوئے قلعے کے ایک مینار کے حجرے میں قید ہونے کے دوران میری ہی تحویل میں تھا۔ میں اُس وقت شاہی ملازم تھا۔ یہ مشابہت اور بھی زیادہ جالبِ توجہ ہوگئی جب اس مرد نے دایاں ہاتھ بلند کیا اور اوپر اٹھی ہوئی انگلیوں پر تیز بلکہ خشونت آمیز نظر ڈالی۔

یہ قریب قریب وہی حرکت تھی جو میں نے اکثر اپنے عالی منزلت قیدی کو کرتے دیکھا تھا۔ ایسا وہ ایک انگوٹھی کو دیکھنے کے لیے کرتا تھا جو اس نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں پہن رکھی تھی اور جسے وہ کبھی اتارتا نہ تھا۔ پھر وہ مرد کمرے میں رکھی میز کے قریب آیا، پانی سے بھرے گول شیشے کو کھسکا کر موم بتی کے سامنے کر دیا اور دونوں ہاتھوں کو انگلیاں پھیلا کر روشنی کے دائرے میں لایا۔ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے ناخنوں کا معائنہ کر رہا ہے۔ پھر اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھا دی اور مجھے آزردہ اور طیش آلود حسد کے شُس احساس میں مبتلا چھوڑ کر کمرے سے چلا گیا۔ آزردگی اور حسد کی وجہ یہ کہ اس کی بیوی کی طلب میرے اندر بتدریج سر اٹھا رہی تھی، کسی پھیلتی ہوئی آگ کی طرح راہ میں حائل چیزوں کی مدد سے زور پکڑ رہی تھی، اور حیران کن انداز میں، اس غیر متوقع نظارے سے اور برف کے ہر اُس گالے سے جو سیلی ہوا سے اڑ اڑ کر میری بھنووں اور رخساروں پر یکے بعد دیگرے لٹک اور پگھل رہے تھے، بھڑک اٹھی تھی۔

میں نے اگلا دن کاہلی میں گزارا۔ میں اس قابل نہ تھا کہ ذہن کو کسی چیز پر مرکوز کر سکوں۔ ایک گھوڑا خریدا جس کی مجھے کوئی خواہش نہ تھی۔ ڈنر کے بعد ڈیوک دے نیمور کو سلام کرنے گیا اور وہاں کچھ وقت تاش کھیلنے اور انتہائی احمقانہ اور ناخوشگوار گفتگو، جو تصور میں آسکتی ہے، سننے میں برباد کیا۔ یہ گفتگو تمام تر

طاعون کے متعلق تھی جو بڑی تیزی سے شہر میں پھیل رہا تھا، چناں چہ لاشوں کو جلد از جلد دفنانے اور اس کمرے میں جہاں کسی کی موت واقع ہوئی ہو، بھس کی آگ جلا کر وبائی ابخروں کو دور کرنے کی ضرورت وغیرہ وغیرہ کے سوا ان بھلے آدمیوں نے کوئی بات کر کے نہ دی۔ لیکن میری رائے میں سب سے بدحواس شاندو کا بڑا پادری لگ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح فربہ اور خوش مزاج تو وہ تھا مگر ایک آنکھ اپنے ناخنوں پر جمائے رہنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں ان پر اس مشکوک نیلاہٹ کے آثار تو نظر نہیں آرہے جو بالعموم طاعون کی پہلی علامت ہوتے تھے۔

ان تمام باتوں سے متنفر ہو کر میں جلد ہی گھر چلا گیا اور بستر پر جالیٹا مگر نیند نہ آئی۔ بے صبری کے مارے، میں نے دوبارہ کپڑے پہن لیے اور تہیہ کیا کہ کچھ بھی ہو، جا کر اپنی محبوبہ سے ملتا ہوں، چاہے مجھے اور میرے آدمیوں کو زبردستی گھر میں داخل ہونا پڑے۔ میں نوکروں کو آواز دینے کھڑکی تک گیا۔ رات کی برفانی ہوا سے میرے ہوش ٹھکانے آگئے اور مجھے احساس ہوا کہ میرے منصوبے کی بدولت یہ سارا قصہ یقیناً ہی ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح کپڑے پہنے پہنے میں نے خود کو پلنگ پر گرا دیا اور آخر سو گیا۔ میں نے اتوار کا دن بھی اسی طور سے گزارا حتیٰ کہ شام ہوگئی اور میں بتائی ہوئی سڑک پر مقررہ وقت سے کہیں پہلے پہنچ گیا لیکن دل پر جبر کر کے قریب کی ایک گلی میں دس بجے تک ٹہلتا رہا۔ پھر میں نے جلد ہی اس کے بتائے ہوئے مکان اور دروازے کو ڈھونڈ لیا۔ اس کے قول کے مطابق دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے بعد غلام گردش اور زینہ واقع تھا۔ لیکن زینے کے اوپر جو دوسرا دروازہ تھا وہ بند تھا۔ البتہ روشنی کی باریک لکیر باہر آرہی تھی۔ سو وہ اندر موجود اور منتظر تھی؛ شاید دروازے کے اُدھر اسی طرح کان لگائے ہوئے تھی جیسے میں دروازے کے اِدھر کان لگائے کھڑا تھا۔ میں نے ناخن سے کواڑ کو کھرچا۔ پھر میں نے اندر ایسی آہٹ سنی جو ننگے پاؤں گھسٹ گھسٹ کر لڑکھڑاتے ہوئے چلنے کی آواز سے مشابہ تھی۔ ذرا دیر تو میں دَم سادھے کھڑا رہا۔ اس کے بعد دوبارہ کواڑ کو کھٹکھٹایا لیکن ایک مرد کی آواز نے جواب میں پوچھا کہ "دروازے پر کون ہے؟" میں کوئی آواز نکالے بغیر دروازے کے سائے میں پیچھے کو دبک گیا۔ دروازہ بدستور بند رہا اور میں دبے پاؤں، آہستہ آہستہ چلتا ہوا زینے سے اتر کر نیچے پہنچا اور پھر غلام گردش سے ہوتا ہوا کھلی ہوا میں نکل گیا اور بے صبری کے عالم میں، کھویا کھویا، ایک یا دو سڑکوں تک ٹہلتا چلا گیا۔ میں نے دانت بھینچ رکھے تھے اور میری کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔ آخر کار مجھ سے رہا نہ گیا اور میں مکان کی طرف لوٹا۔ میرا فوراً اندر جانے کا ارادہ نہ تھا۔ مجھے احساس ہوا، بلکہ یقین سا ہو چلا، کہ وہ شوہر کو کہیں بھیج دے گی، وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی، اسے ضرور کامیاب ہونا چاہیے، اور پھر میرے لیے فی الفور اس کے پاس پہنچ جانا ممکن ہوگا۔ سڑک تنگ تھی۔ اس کے ایک طرف مکانات نہیں تھے بلکہ ایک کانونٹ کے باغ کی دیوار تھی۔ میں اس دیوار سے چپک کر

کھڑا ہو گیا اور سڑک کی دوسری جانب سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کے کمرے کی کھڑکی کون سی ہے۔ یکایک دوسری منزل پر ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں روشنی سی بھڑکی اور بجھ گئی۔ وہ بیتا ہوا سارا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ اس نے جیسے اس رات کی طرح ایک بڑا لٹھا آتش دان میں پھینکا ہو۔ اسی رات کی طرح وہ کمرے کے بیچ میں کھڑی ہو، سراپے پر آگ کی دہک چھائی ہوئی ہو، یا بستر پر بیٹھی، کان لگائے، منتظر ہو۔ میں اسے دروازے میں کھڑے ہو کر دیکھوں گا اور اس کی گردن اور کندھوں کا سایہ اس غیر مرئی موج میں دیوار پر چڑھ اتر رہا ہوگا۔ میں اتنے میں غلام گردش میں پہنچ بھی چکا تھا، سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ اس کے ادھ کھلے کواڑوں سے جھلملاتی روشنی باہر آرہی تھی۔ میں نے دروازے کے قبضے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایسا لگا جیسے میں کئی آدمیوں کو اندر بولتے چالتے اور چلتے پھرتے سن سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور میں نے سوچا کہ گردن اور کنپٹیوں میں خون کی تیز گردش اور اندر کمرے میں بھڑکتی آگ کی وجہ سے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ اس رات بھی آگ بہت پُرشور انداز میں جل رہی تھی۔ میرا ہاتھ ابھی دروازے کے قبضے پر تھا کہ مجھ پر واقعی یہ انکشاف ہوا کہ کمرے میں لوگ موجود ہیں — کئی آدمی ہیں۔ لیکن اب مجھے کوئی پروا نہ تھی کیوں کہ میں محسوس کر رہا تھا، میرا دل جانتا تھا، کہ وہ بھی وہاں موجود ہے اور دروازہ کھولتے ہی اسے دیکھ لوں گا، اپنے سینے سے لگالوں گا اور چاہے اسے دوسروں کے ہاتھوں سے چھیننا پڑے، میں ایک ہاتھ سے اسے تھامے، چیختے چلاتے مردوں عورتوں کے حملہ آور ہجوم کو تلوار اور خنجر کے زور سے پیچھے دھکیلتا ہوا نکل جاؤں گا۔ جو چیز مجھے بالکل ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھی وہ مزید توقف تھا۔

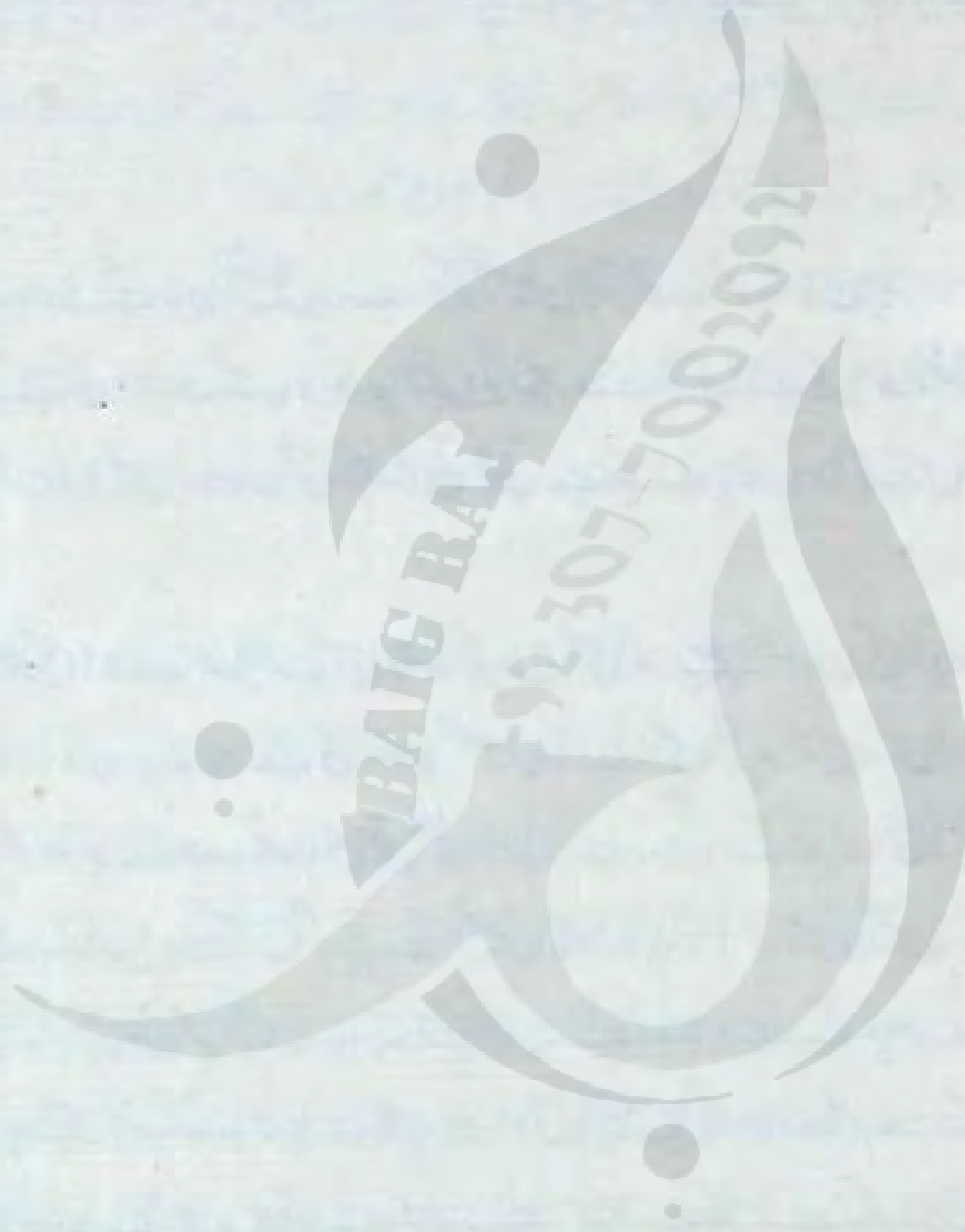
میں نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے یہ منظر دکھائی دیا:

خالی کمرے کے بیچ میں چند آدمی کھڑے بستروں کے نیچے بچھایا جانے والا بُھس جلا رہے تھے اور شعلوں کی روشنی میں، جو تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، میں نے پھولی پھولی دیواریں دیکھیں جن کا پلستر فرش پر بکھرا پڑا تھا، اور ایک دیوار سے ملی ہوئی میز رکھی تھی جس پر دو ننگی لاشیں پڑی تھیں، ایک بہت بڑی تھی، اس کا سر ڈھکا ہوا تھا۔ دوسری لاش نسبتاً چھوٹی تھی اور دیوار سے ملی ہوئی دراز تھی۔ اس کے بدن کا کالا سایہ ساتھ کی دیوار پر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

میں لڑکھڑاتا ہوا زینے سے اترا اور مکان کے سامنے میری دو گورکنوں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے اپنی چھوٹی سی لالٹین اوپر اٹھا کر میرے چہرے کے قریب کر دی اور پوچھنے لگا کہ ''تمھیں کیا لینا دینا ہے؟'' دوسرے نے بوجھ سے چرچراتے اور چوں چوں کرتے ٹھیلے کو دھکیل کر دروازے سے لگا دیا۔ میں نے انھیں پرے رکھنے کے لیے خنجر تان لیا اور گھر لوٹ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے فوراً تندو تیز

شراب کے تین چار جام اوپر تلے پیے اور سو لینے کے بعد لورین کی طرف چل دیا۔

واپس آ کر میں نے اس عورت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنے کی جتنی بھی کوششیں کیں سب ناکام رہیں۔ میں تو اس دکان پر بھی گیا جس پر دو فرشتوں کا نشان بنا ہوا تھا مگر جو لوگ اس کے مالک تھے انھیں پتا نہیں تھا کہ ان سے پہلے وہ کس کے پاس تھی۔



اِلسے آئخنگر

الٹی کہانی

اگر کوئی تمھارے بستر کو وارڈ سے باہر دھکیل دے، اگر تمھیں نظر آئے کہ آسمان سبز ہو چلا ہے اور اگر تم نائب پادری کو تدفین کا وعظ کہنے کی زحمت نہیں دینا چاہتیں تو پھر وقت آ گیا ہے کہ اٹھ بیٹھو، سچ سچ جیسے بچے اٹھ بیٹھتے ہیں جب صبح دم شگافوں میں سے روشنی جھلملاتی آتی ہے، دبے پاؤں، تاکہ نرس کی نظر تم پر نہ پڑ سکے — اور جھٹ پٹ!

لیکن دیر بڑی ہوگئی، نائب صاحب اپنا وعظ شروع بھی کر چکے۔ تم ان کی آواز سن سکتی ہو، جوان اور مشتاق اور لامتناہی آواز، ان کے بولنے کی آواز تمھیں آنے بھی لگی۔ یہی سہی! ان کے بھلے لفظوں کو دھواں دھار بارش میں محو ہو جانے دو۔ تمھاری قبر کھلی ہوئی ہے۔ ان کے طرار اعتماد پر پہلے بیچارگی طاری تو ہونے دو تاکہ پھر اسے سہارا دیا جا سکے۔ اگر تم نے انھیں چھوڑ دیا تو آخر میں انھیں یہ بھی پتا نہ چلے گا کہ وہ شروع بھی کر چکے ہیں۔ اور چوں کہ انھیں یہ پتا نہیں اس لیے وہ تابوت کے چادر برداروں کو اشارہ کرتے ہیں اور چادر بردار کچھ پوچھے بغیر تمھارا تابوت پھر سے نکال لیتے ہیں اور وہ تابوت کے ڈھکن سے پھولوں کا ہار اٹھا کر اس نوجوان کو لوٹا دیتے ہیں جو قبر کے کنارے سر جھکائے کھڑا ہے۔ نوجوان پھولوں کا ہار لے لیتا ہے اور خفت مٹانے کے لیے ہاتھ سے سارے ربنوں کی سلوٹیں دور کرنے لگتا ہے۔ وہ لمحے بھر کے لیے نظریں اٹھاتا ہے اور بارش اس کے رخساروں پر چند آنسو جھٹک دیتی ہے۔ پھر جنازہ دیوار کے ساتھ ساتھ پلٹتا ہے۔ چھوٹی سی بھونڈی نماز گاہ میں شمعیں دوبارہ روشن ہوتی ہیں اور نائب صاحب مردوں کی مناجات پڑھتے ہیں تاکہ تم جی جاؤ۔ نائب صاحب نوجوان سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہیں اور جھینپتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ اسے ہر خوشی نصیب ہو۔ یہ پہلا جنازہ ہے جو انھوں نے پڑھایا ہے اور لجاہٹ کے مارے ان کا چہرہ کالر تک لال ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی تصحیح کر سکیں، نوجوان چلا جاتا ہے۔ اب کوئی کرے تو کیا کرے؟ اگر آپ کسی سوگوار کو ہر خوشی نصیب ہونے کی دعا دے بیٹھیں تو پھر مردے کو دوبارہ

گھر بھجوا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس کے فوراً بعد تابوت بردار گاڑی تمھارا تابوت لے کر لمبی سڑک کے راستے واپس جاتی ہے۔ دائیں اور بائیں جانب مکانات ہیں جہاں ہر کھڑکی میں نرگس کے پھول لہلہا رہے ہیں، وہی زرد پھول جو ہر ہار میں گوندھے جاتے ہیں۔ اس بارے میں کوئی کچھ کر تو سکتا نہیں۔ بچے کھڑکیوں کے بند شیشوں سے منھ لگا کر جھانکتے ہیں۔ بارش ہو رہی ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے ایک اگلے دروازے سے دوڑ کر باہر آئے گا۔ وہ تابوت بردار گاڑی کے پیچھے لٹک جاتا ہے، اسے دھکا دے کر اتار دیا جاتا ہے اور وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ بچہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیتا ہے اور غصے سے تمھیں جاتے دیکھتا ہے لیکن جب کوئی قبرستان کو جانے والی سڑک پر رہتا ہو تو اور کہاں جا کر جھولا جھولے؟

تمھاری گاڑی چوراہے پر سبز اشارے کا انتظار کر رہی ہے۔ بارش ہلکی ہو چلی ہے۔ بوندیں گاڑی کی چھت پر ناچتے ناچتے نیچے آ رہی ہیں۔ کہیں دور سے چری کی باس آتی ہے۔ سڑکوں کو تازہ تازہ بچتمہ دیا گیا ہے، آسمان نے سب چھتوں پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ نرے تہور کے مارے تمھاری گاڑی ٹرام کے ساتھ دوڑ لگاتی ہے۔

سڑک کے کنارے پر کھڑے دو بچوں نے اس بارے میں اپنی اپنی عزت داؤ پر لگا دی ہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ تیز چل رہی ہے، لیکن جس بچے نے ٹرام پر داؤ لگایا تھا وہ ہار جائے گا۔ تم اسے متنبہ کر سکتی تھیں لیکن اس قسم کا افتخار حاصل کرنے کے لیے کوئی آج تک اپنے تابوت سے نہیں اٹھا۔

صبر سے کام لو۔ آخر، ابھی تو موسم گرما کا آغاز ہی ہوا ہے۔ صبح ابھی رات کے پچھلے پہر تک پھیلی ہوتی ہے۔ تم بروقت پہنچ جاتی ہو۔ اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو اور سارے بچے سڑک کے کناروں سے غائب ہو جائیں، گاڑی ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوتی ہے۔ چاندنی کی ایک کرن سیدھی دروازے پر پڑتی ہے۔ لوگ جلد ہی آ کر گاڑی سے تمھارا تابوت اتار لیتے ہیں اور تابوت بردار گاڑی خوشی خوشی اپنے گھر کا راستہ لیتی ہے۔

وہ تمھارا تابوت اٹھا کر دوسرے دروازے میں سے احاطے کے پار مردہ خانے میں لے جاتے ہیں۔ وہاں خالی تابوت گاہ، سیاہ اور بے ہنگم اور چبوترا سی، منتظر ہے اور وہ تابوت اس پر رکھ دیتے ہیں اور اسے دوبارہ کھولنے لگتے ہیں اور ان میں سے ایک گالی دیتا ہے کیوں کہ میخیں بڑی مضبوطی سے ٹھکی ہوئی ہیں۔ لعنت ہو اس طرح کوئی کسر نہ چھوڑنے پر!

تھوڑی دیر بعد وہ نوجوان بھی آ جاتا ہے اور پھولوں کا ہار لوٹا دیتا ہے۔ آخری وقت ہوتے تک آ ہی گیا۔ وہ ربنوں کو ترتیب دے کر سرہانے رکھ دیتے ہیں۔ یہ لو، اب تم اطمینان کا سانس لے سکتی ہو، پھولوں

کا ہار بالکل ٹھیک حالت میں ہے۔ صبح تک کمھلائے ہوئے پھول تازہ ہو جائیں گے اور سمٹ کر کلیاں بن جائیں گے۔ رات بھر تم ہاتھوں کے بیچ میں صلیب لیے تن تنہا پڑی رہتی ہو اور تمھارا دن بھی خوب آرام سے گزرے گا۔ بعدازاں تمھیں اتنے چین سے لیٹے رہنا نصیب نہ ہوگا۔

اگلے روز وہ نوجوان پھر آتا ہے اور چوں کہ بارش نے اسے آنسوؤں کا کوئی چھینٹا نہیں دیا اس لیے وہ کھڑا خلا میں گھورتا اور اپنی ٹوپی کو انگلیوں میں مروڑتا رہتا ہے۔ صرف اس وقت جب وہ تابوت کو اٹھا کر دوبارہ ٹھاٹر پر رکھنے لگتے ہیں تو وہ اپنا منھ ہاتھوں میں چھپالیتا ہے۔ وہ رو رہا ہے۔ تم اب مردہ خانے سے جارہی ہو۔ وہ کس لیے رو رہا ہے؟ تابوت کا ڈھکن اکھڑ چکا ہے اور دن کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ چڑیاں خوشی سے چہچہا رہی ہیں۔ انھیں یہ پتا نہیں کہ مرے ہوؤں کو جگانا منع ہے۔ نوجوان تمھارے تابوت کے آگے آگے پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا چل رہا ہے۔ ہوا ٹھنڈی اور کسی نٹ کھٹ بچے کی طرح کھلنڈری ہے۔

وہ تمھیں اندر اور سیڑھیوں کے راستے اوپر لے جاتے ہیں۔ تمھیں تابوت سے نکالا جاتا ہے۔ تمھارا بستر تازہ تازہ بچھایا گیا ہے۔ نوجوان کھڑکی میں سے احاطے پر نظر ڈالتا ہے جہاں دو فاختائیں جفتی کھانے اور زور زور سے کوکو کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ گھن کھا کر منھ پھیر لیتا ہے۔

اور اب وہ تمھیں پھر سے بستر پر لٹا چکے ہیں اور انھوں نے تمھارے منھ پر ڈھاٹا باندھ دیا ہے اور ڈھاٹے کی وجہ سے تم اتنی عجیب لگ رہی ہو۔ نوجوان چیخیں مارنے لگتا ہے اور تم سے لپٹ جاتا ہے۔ وہ نرمی سے اسے وہاں سے لے جاتے ہیں۔ تمام دیواروں پر ''خاموش رہنا فرض ہے'' لکھا ہوا ہے، آج کل ہسپتالوں میں گنجائش سے زیادہ لوگ ٹھنسے رہتے ہیں، مرے ہوؤں کو ہرگز بہت جلد جاگنا نہ چاہیے۔

بندرگاہ میں جہاز بھاری آواز میں زفیلتے ہیں۔ آرہے ہیں یا روانہ ہو رہے ہیں؟ کون جانے؟ چپ رہو، خاموش رہنا فرض ہے۔ مرے ہوؤں کو وقت سے پہلے مت جگاؤ، مرے ہوئے ہلکی نیند سوتے ہیں۔ لیکن جہاز برابر سیٹیاں بجا رہے ہیں اور تھوڑی دیر بعد انھیں طوعاً و کرہاً، تمھارے منھ پر بندھا ڈھاٹا کھولنا پڑے گا اور وہ تمھارا ہاتھ منھ دھوئیں گے اور تمھارا کرتا بدل دیں گے اور ان میں سے کوئی جلدی سے تمھارے دل پر جھکے گا، جلدی سے، جب تم ابھی مردہ ہوگی۔ وقت تھوڑا رہ گیا ہے اور یہ سب جہازوں کا کیا دھرا ہے۔ صبح اندھیری ہوتی جارہی ہے۔ وہ تمھاری آنکھیں کھولتے ہیں جو سفید سفید چمکتی ہیں۔ وہ تمھارے پُرسکون نظر آنے کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کرتے، خدا کا شکر ہے، لفظ ان کے حلق میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ذرا انتظار کرو۔ وہ جلد ہی چلے جائیں گے۔ گواہ کوئی نہیں بننا چاہتا کیوں کہ اس بنا پر لوگوں کو آج بھی نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔

وہ تمھیں اکیلا چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ تمھیں اتنا اکیلا چھوڑ جاتے ہیں کہ تم آنکھیں کھولتی ہو اور ہرے ہرے آسمان کو دیکھتی ہو، وہ تمھیں اتنا اکیلا چھوڑ جاتے ہیں کہ تم سانس لینے لگتی ہو، بھاری اور اٹکتے ہوئے اور گہرے سانس، کھڑکھڑاتے ہوئے، جیسے لنگر ڈالتے وقت زنجیر کا شور۔ تم لیٹے لیٹے اچھل پڑتی ہو اور اپنی ماں کو پکارتی ہو۔ آسمان کتنا ہرا ہے!

''ہذیانی کیفیت رفع ہو چلی ہے،'' کوئی تمھارے پیچھے سے کہتا ہے۔ ''گھنگرو بجنے لگا ہے۔'' اور، یہ لوگ! انھیں اس بارے میں بھلا کیا پتا ہے؟

اب چلی جاؤ! یہی موقع ہے۔ ان سب کو کہیں اور بلایا جا چکا ہے۔ ان کے لوٹ آنے سے پہلے، ان کی سرگوشیاں بلند ہونے سے پہلے، چلی جاؤ، سیڑھیاں اتر کے، ہال میں بیٹھے دربان کے پاس سے ہو کے، اس صبح میں سے گزر کے جو رات میں بدلتی جا رہی ہے۔ اندھیرے میں چڑیاں اس طرح چیختی ہیں جیسے تمھاری ٹیسیں جشن منا رہی ہوں۔ گھر جاؤ! اور اپنے بستر پر جا کر لیٹو، چاہے اس پر ابھی تک سلوٹیں پڑی ہوں، چاہے پلنگ کی چولیں چرچراتی ہوں۔ وہاں تم زیادہ جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تم وہاں صرف تین دن اپنے آپ پر کھولتی رہتی ہو اور ہرے آسمان کو آنکھوں ہی آنکھوں میں جی بھر کے پی لیتی ہو، صرف تین دن تم وہاں اس شوربے کو جو اوپر رہنے والی عورت لے کر آتی ہے پرے ہٹاتی ہو اور چوتھے دن اسے ہاتھ بڑھا کر لے لیتی ہو۔

اور ساتویں دن، جو تمھارے آرام کا دن ہے، تم وہاں سے چلی جاتی ہو۔ درد تمھیں ہانکے لیے جاتا ہے، تم راستہ ڈھونڈ لو گی، پہلے بائیں طرف، پھر دائیں طرف، پھر دوبارہ بائیں طرف، گودی کے قرب و جوار کی گلیوں میں سے ہو کے، جن پر اس درجہ افلاس طاری ہے کہ وہ سمندر کی طرف جانے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتیں۔ کاش وہ نوجوان کہیں آس پاس ہوتا لیکن نوجوان تمھارے ساتھ نہیں ہے، تابوت میں تم کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھیں لیکن اب تمھارا چہرہ درد سے مسخ ہو چکا ہے، درد نے جشن منانا چھوڑ دیا ہے اور اس وقت بھی۔ سارے راستے — تمھارا ماتھا پسینے میں بھیگا جا رہا ہے۔ نہیں، تم تابوت میں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھیں۔

سڑک پر بچے گولیاں کھیل رہے ہیں۔ تم جلدی میں ان سے ٹکرا جاتی ہو، ایسا لگتا ہے تم الٹی ہو کر آگے کو دوڑی جا رہی ہو اور ان بچوں میں سے کوئی تمھارا نہیں۔ جب تم اس بڑھیا کے پاس جا رہی ہو جو شراب خانے کے ساتھ والے گھر میں رہتی ہے تو ان میں سے کوئی تمھارا ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ ساری بندرگاہ کو پتا ہے کہ بڑھیا کے پاس شناپس پینے کے لیے رقم کہاں سے آتی ہے۔

وہ پہلے ہی سے دروازے میں کھڑی ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور وہ تمھاری طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔

اس کا ہاتھ گندا ہے۔ وہاں ہر چیز ہی گندی ہے۔ آتش دان پر پیلے پھول دھرے ہیں اور یہ وہی پھول ہیں جنھیں ہاروں میں گوندھا جاتا ہے، یہ پھر وہی پھول ہیں اور بڑھیا ضرورت سے زیادہ اخلاص دکھا رہی ہے اور سیڑھیاں یہاں بھی چرچراتی ہیں اور تم جہاں بھی جاؤ جہازوں کے بین سنائی دیتے ہیں، وہ ہر جگہ بین کرتے ہیں۔ درد تمھیں جھنجھوڑے ڈال رہا ہے مگر خبردار ہرگز جو آواز نکالی۔ بڑھیا کو شناپس کے لیے رقم دے دو! جب تم اسے رقم دے چکتی ہو تو وہ دونوں ہاتھوں سے تمھارا منھ بند کر دیتی ہے۔ اتنی شناپس پی جانے کے باوجود بڑھیا کو ذرا نشہ نہیں۔ وہ نازائیدوں کے خواب نہیں دیکھتی۔ معصوم بچوں کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اولیاء سے اس کی شکایت کر سکیں اور عاصی بچوں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی۔ لیکن تم— تم جرأت دکھاتی ہو۔

''میرے بچے کو دوبارہ زندہ کر دو!''

بڑھیا سے یہ بات اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کہی۔ لیکن تم یہ بات کہتی ہو۔ آئینہ تمھیں طاقت دیتا ہے۔ اندھا آئینہ، جس پر مکھیوں کی نجاست لگی ہوئی ہے، تمھیں وہ کچھ کہنے کی اجازت دیتا ہے جو اس سے پہلے کوئی نہیں کہہ سکا۔

''اسے زندہ کر دو ورنہ میں تمھارے پیلے پھول نیچے گرا دوں گی، ورنہ میں تمھاری آنکھیں نوچ لوں گی، ورنہ میں زور سے جھٹکا دے کر یہ کھڑکیاں کھول دوں گی اور پکار کر کہوں گی تاکہ میری آواز ساری گلی میں پہنچ جائے، تاکہ ان سب کو وہ کچھ سننا بھی پڑے جو انھیں پہلے ہی سے معلوم ہے، میں چیخوں گی...''

یہ سن کر وہ گھبرا جاتی ہے۔ اور بری طرح گھبرا جانے کے باعث وہ، اندھے آئینے میں تمھاری استدعا مان لیتی ہے۔ اسے یہ تو پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کر رہی ہے لیکن اندھے آئینے میں وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ دہشت ہولناک صورت اختیار کر لیتی ہے اور ٹیس آخر کار پھر سے جشن منانا شروع کر دیتی ہے اور اس سے پہلے کہ تم چیخ مار سکو تمھیں یہ لوری یاد آ جاتی ہے: ''سو جا، ننھے منے سو جا!'' اور اس سے پہلے کہ تم چیخ مار سکو آئینہ تمھیں اندھیری سیڑھیوں پر دھکا دے کر دوبارہ نیچے گرا دیتا ہے اور وہاں سے چلنے جانے پر، بھاگ جانے پر، مجبور کر دیتا ہے۔ اتنی بے تحاشا نہ بھاگو!

اپنی نظر زمین پر یوں نہ جمائے رہو، بہتر ہے نظر اٹھا کر بھی دیکھ لو ورنہ شاید اس خالی جگہ کے گرد بنے ہوئے جنگلے کے پاس، جس میں کوئی عمارت بنی ہے، تم ایک آدمی سے، ایک نوجوان سے ٹکرا جاؤ جو کھڑا اپنی انگلیوں سے ٹوپی مروڑ رہا ہے۔ یوں تم اسے پہچان لیتی ہو۔ یہ وہی ہے جو ذرا دیر پہلے تمھارے تابوت کے پاس کھڑا اپنی ٹوپی ہاتھوں میں مروڑ رہا تھا۔ وہ یہاں پھر موجود ہے! ایسے کھڑا ہے جیسے کبھی یہاں سے گیا ہی نہ ہو، وہ رہا، جنگلے سے ٹیک لگائے ہوے۔ تم اس کی بانہوں میں گر پڑتی ہو۔ اب کے بھی اس کے پاس

آنسو نہیں۔ تم اپنے کچھ آنسو اسے دے دو۔ اور اس کی بانہہ پکڑنے سے پہلے اسے خدا حافظ کہو۔ اس سے رخصت ہو۔ اگر وہ بھول بھی گیا تو تم نہیں بھولوگی۔ وداع ہونے کی نوبت شروع ہی میں آجاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ اور آگے جاؤ تمھیں اس جنگلے کے پاس، جو عمارت کے لیے خالی جگہ کے گرد بنا ہوا ہے، ہمیشہ کے لیے جدا ہونا پڑے گا۔

تم آگے چلتے جاتے ہو۔ ایک راستہ ہے جو کوئلے کے گوداموں کے پاس سے ہوتا ہوا سمندر کو جاتا ہے۔ تم آگے چلتے جاتے ہو۔ تم دونوں خاموش ہو۔ تم پہلے لفظ کی منتظر ہو، تم پہلا لفظ اس کے حصے میں آنے دیتی ہو تاکہ آخری لفظ تمھارے پاس ہی نہ رہ جائے۔ وہ کیا کہے گا؟ جلدی سے، سمندر کنارے پہنچنے سے پہلے جہاں پہنچ کر تم بے پروا ہو جاتی ہو۔ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ پہلا لفظ کیا ہے؟ تو کیا وہ اتنا مشکل ہے کہ اسے ادا کرتے ہوئے وہ ہکلا رہا ہے، اپنی نظریں جھکائے رکھنے پر مجبور ہو گیا ہے؟ یا یہ باڑ سے پرے کوئلے کے اونچے اونچے چوٹی دار ڈھیر ہیں جو اس کی آنکھوں پر سائے ڈال رہے ہیں اور اپنی سیاہی سے اسے خیرہ کیے دے رہے ہیں؟ پہلا لفظ — اب اس نے کہہ دیا۔ وہ ایک سڑک کا نام ہے۔ یہ تو اسی گلی کا نام ہے جس میں وہ بڑھیا رہتی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ اس سے پہلے کہ اسے پتا چلتا کہ تم امید سے ہو اس نے بڑھیا کا ذکر چھیڑ دیا، اس سے پہلے کہ وہ یہ کہتا کہ اسے تم سے محبت ہے وہ بڑھیا کا نام لے رہا ہے۔ پرسکون رہو، اسے یہ معلوم نہیں کہ تم بڑھیا کے پاس سے ہو کے آرہی ہو، اسے یہ معلوم ہو بھی نہیں سکتا، اسے آئینے کے بارے میں کچھ پتا نہیں اور یہ بات کہتے ہی وہ اسے بھول بھی گیا۔ آئینے میں ہر بات صرف اس لیے کہی جاتی ہے کہ اسے بھلا دیا جائے اور یہ بات کہتے کہتے کہ تم امید سے ہو تم نے اس خبر کو دبا بھی دیا۔ آئینہ ہر چیز کو منعکس کرتا ہے۔ کوئلے کے چوٹی دار ٹیلے دھندلا کر پیچھے رہ گئے۔ تم دونوں سمندر کے کنارے ہو اور تمھاری حدِ نظر پر سفید کشتیاں سوالوں کے مانند نظر آرہی ہیں۔ چپ چاپ رہو، سمندر تمھارے ہونٹوں سے جواب لپک لیتا ہے، تم اور جو کچھ ابھی کہنا چاہتی تھیں سمندر اسے نگل جاتا ہے۔

وہاں سے تم متعدد بار ساحل سے اس طرح پلٹتی ہو جیسے ساحل کی طرف جارہی ہو، اس طرح گھر کا رخ کرتی ہو جیسے گھر سے بھاگی جارہی ہو اور گھر چھوڑ کے جاتی ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے گھر جارہی ہو۔

چمکیلے ٹوپے پہنے وہ کیا سرگوشی کر رہے ہیں؟ ''گھنگرو بجنے لگا۔'' انھیں بتیانے دو۔

ایک روز آسمان خاصا پیلا ہو جائے گا، اتنا پیلا کہ اس کی پیلاہٹ جگمگائے گی۔ منتہی پیلاہٹ کے سوا کیا کوئی اور تجلی بھی ہے؟

اس دن اندھا آئینہ معتوب مکان کو منعکس کرتا ہے۔ لوگ اس مکان کو ''معتوب'' کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کا گرایا جانا طے پا چکا ہو، وہ اسے معتوب کہتے ہیں، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔

تمھیں خائف نہ ہونا چاہیے۔ آسمان اب خاصا پیلا ہے۔ اور پیلاہٹ لیے آسمان کی طرح مکان بھی اپنے عتاب کے اختتام پر سعادتِ روحانی کا منتظر ہے۔ بہت زیادہ ہنسنے کے بعد آنسو آسانی سے بہتے ہیں۔ تم بہت رو چکی ہو۔ اپنا پھولوں کا ہار واپس لے لو۔ تمھیں جلد ہی اپنی چٹیاں کھولنے کی اجازت مل جائے گی۔ ہر چیز آئینے میں موجود ہے اور تمھاری کی ہوئی ہر بات کی اوٹ میں سمندر ہراہرا پھیلا ہوا ہے۔ جب تم مل کر مکان سے باہر قدم دھرتی ہو تو وہ تمھارے سامنے پھیل جاتا ہے۔ جب تم اندر کو ڈھیتی کھڑکیوں کے راستے چڑھ کر باہر آتی ہو تو بھول چکی ہوتی ہو۔ آئینے میں ہر بات اس لیے کی جاتی ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔

اس کے بعد وہ تم پر زور دیتا ہے کہ تم اس کے ساتھ اندر چلی چلو۔ لیکن تم شوق کے مارے گھر کو پیچھے چھوڑ کر چل پڑتی ہو اور ساحل سے منھ موڑ لیتی ہو۔ تم مڑ کر نہیں دیکھتیں۔ معتوب گھر پیچھے رہ جاتا ہے۔ تم دریا کی طرف جاتی ہو اور تمھارا اپنا بخار بہتا ہوا تمھاری طرف آتا ہے، تمھارے پاس سے ہو کر بہتا ہے۔ جلد ہی اس کی منت سماجت مدھم پڑ جاتی ہے اور عین اسی لمحے تم اب خود کو تیار نہیں پاتیں، تم دونوں کو زیادہ لاج آنے لگی ہے۔ یہ وہ جزر ہے جو سمندر کو سب ساحلوں سے کھینچے لیے جاتا ہے۔ جزر کے موقع پر دریا تک اتھلے ہو جاتے ہیں اور ادھر پرلے کنارے پر درختوں کی پھنگیں بالآخر ان کے چھتر کی جگہ لے لیتی ہیں۔ ان کی چھاؤں میں سفید کھپریل کی چھتیں سو رہی ہیں۔

محتاط رہو، اب وہ مستقبل اور ڈھیر سارے بچوں اور طویل زندگی کے بارے میں باتیں شروع کرنے والا ہے اور اس کے رخسار ولولے سے تمتما اٹھیں گے۔ ان کی وجہ سے تمھارے رخسار بھی دہکنے لگیں گے۔ اور تم اس بارے میں بحثو گی کہ آیا تمھیں بیٹے چاہییں یا بیٹیاں اور تم بیٹوں کو ترجیح دو گی۔ اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے مکان کی چھت ٹائلوں کی ہو جبکہ تم یہ پسند کرو گی کہ... لیکن اب تم دونوں دریا کے بہاؤ کے الٹ چلتے چلتے بہت دور نکل گئے ہو۔ خوف تمھیں اپنے چنگل میں داب لیتا ہے۔ پرلی طرف کھپریل کی چھتیں غائب ہو چکی ہیں۔ اب اُدھر صرف چراگاہیں اور ترائی ہے، اور اِدھر؟ پگڈنڈی پر نظر رکھو۔ جھٹپٹا چھا رہا ہے، بے کیفی سے، جس طرح صرف تڑکا ہو سکتا ہے۔ مستقبل بیت چکا ہے۔ مستقبل دریا کنارے ایک پگڈنڈی ہے جو ترائی میں پہنچ کر ناپید ہو جاتی ہے۔ لوٹ جاؤ!

اب کیا ہوگا؟

تین دن بعد اسے تمھارے گلے میں بانہہ ڈالنے کی ہمت بھی نہ ہوتی۔ تین دن اور، اور وہ تم سے تمھارا اور تم اس سے اس کا نام پوچھتی ہو۔ اب تم ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ اور اب تم نام پوچھتے بھی نہیں۔ یہی بہتر ہے۔ کیا تم ایک دوسرے کے لیے سرِ نہاں نہیں بن چکے؟

اب آخر کار تم دوبارہ چپ چاپ پہلو بہ پہلو چلتے ہو۔ اگر اب وہ تم سے کچھ پوچھے گا بھی تو بس یہی کہ بارش برسے گی کہ نہیں۔ کون بتا سکتا ہے؟ تمھاری بیگانگی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ مستقبل کے بارے میں بات کرنا تم نے مدت ہوئی چھوڑ دیا۔ اب تم ایک دوسرے سے بہت کم ملتے ہو لیکن ابھی ایک دوسرے سے بالکل بیگانہ نہیں ہوے۔ انتظار کرو، صبر سے کام لو۔ ایک روز وہ مرحلہ بھی آجائے گا۔ ایک روز وہ تمھارے لیے اس حد تک اجنبی بن چکا ہو گا کہ تم ایک کھلے پھاٹک کے سامنے کسی اندھیری گلی میں اس سے پیار کرنے لگو گی۔ ہر بات کا اپنا موقع محل ہوتا ہے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے۔

''تھوڑی دیر کی بات ہے،'' تمھارے پیچھے کھڑے وہ کہتے ہیں۔ ''خاتمہ قریب ہے۔''

انھیں اس بارے میں کیا معلوم؟ کیا ہر چیز بس ابھی ابھی شروع نہیں ہوئی ہے؟

ایک دن ایسا آئے گا جب تم اسے پہلی بار دیکھو گی اور وہ تمھیں دیکھے گا۔ پہلی بار، جس کا مطلب ہے، اس کے بعد کبھی نہیں، لیکن ڈرو مت، تمھیں ایک دوسرے سے جدا ہونے کی ضرورت نہیں، تم مدتیں ہوئیں جدا ہو چکے۔ کیسا اچھا ہے کہ تم پہلے ہی جدا ہو چکے ہو۔

وہ پت جھڑ کا دن ہو گا، اس توقع سے مالامال کہ سب پھل دوبارہ پھول بن جائیں گے، جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے، چمکیلے دھوپ والی پت جھڑ جس کے سائے قدموں بیچ کرچوں کی طرح یوں بکھرے رہتے ہیں کہ ان سے تمھارا پاؤں کٹ سکتا ہے، یوں کہ جب تمھیں سیب لینے بازار بھیجا جاتا ہے تو تم ان سے ٹھوکر کھا کر گر سکتی ہو، تم نپٹ امید اور خوشی کے مارے گر سکتی ہو۔ ایک نوجوان تمھاری مدد کو آتا ہے۔ اس نے جاکٹ پہننے کی بجائے اوڑھ سی رکھی ہے اور وہ مسکراتا ہے اور اپنی ٹوپی کو انگلیوں میں مروڑتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہے۔ تم دونوں اس بچھڑتی روشنی میں بہت خوش ہو۔ تم اس کا شکریہ ادا کرتی ہو اور سر کو جھٹک کر ذرا سا پیچھے کرتی ہو تو پن لگی لٹیں کھل کر نیچے گر جاتی ہیں۔ ''اوہ!'' وہ کہتا ہے، ''تم ابھی سکول میں ہو نا؟'' وہ مڑتا ہے اور سیٹی پر کوئی دھن بجاتا چل دیتا ہے۔ اس طرح تم بچھڑتے ہو، ایک دوسرے کی طرف دوبارہ دیکھتے تک نہیں، بغیر کسی دکھ کے اور بغیر یہ جانے کہ تم جدا ہو رہے ہو۔

اب تم اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے کھیلو اور دریا کے کنارے اس پگڈنڈی پر ان کے ساتھ ٹہلو جس پر آلڈر کے درختوں کی چھاؤں ہے اور جہاں پرلی طرف ہمیشہ کی طرح، درختوں کی پھننگوں کے درمیان سفید کھپریل کی چھتیں ہیں۔ مستقبل کیا لے کے آیا ہے؟ ایک بھی بیٹا نہیں، وہ تمھارے لیے بھائی لے کے آیا ہے اور چٹیاں، جنھیں تم ہلاتی پھرو، گیندیں، جنھیں تم اچھالا کرو۔ مستقبل سے خفا نہ ہو، اس کے پاس اس سے بہتر کچھ نہ تھا۔ سکول شروع ہو سکتا ہے۔

ابھی تم زیادہ بڑی نہیں ہوئیں۔ ابھی تو تم لمبے وقفے کے دوران میں بس دو دو کی ٹولیوں میں کھیل

کے میدان کے چکر لگاؤ اور انگلیاں منہ پر رکھ کر کھسر پھسر کرو اور شرماؤ اور ہنسو۔ لیکن ایک سال اور انتظار کرلو اور پھر تمھیں رسی کودنے اور اچھل کر دیواروں پر جھکی ہوئی ٹہنیاں نوچنے کی اجازت مل جائے گی۔ تم غیر ملکی زبانیں بھی سیکھ چکی ہو لیکن اب وہ آسانی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ تمھاری اپنی زبان کہیں زیادہ مشکل ہے۔ لکھنا پڑھنا اور بھی زیادہ مشکل ثابت ہوگا لیکن سب سے مشکل کام ہر چیز کو بھلانا ہے اور اگر تمھارے لیے پہلے امتحان کے موقع پر ہر چیز جاننا ضروری تھا تو اب آخر میں تمھیں اور کچھ نہ جاننے کی اجازت ہے۔ کیا تم پاس ہو جاؤ گی؟ کیا تم خوب نچلی رہو گی؟ اگر تم ڈری رہو کہ تمھیں منہ کھولنے کی ہمت نہ ہو تو کام بن جائے گا۔

تم اس نیلی ٹوپی کو جو سکول کے سارے بچے پہنتے ہیں دوبارہ کھونٹی پر لٹکا دیتی ہو اور اسکول سے رخصت ہوتی ہو۔ پت جھڑ پھر آ گئی ہے۔ پھول کبھی کے کلیوں میں، کلیاں نیستی میں اور نیستی دوبارہ پھلوں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ہر طرف چھوٹے چھوٹے بچے، جو تمھاری طرح اپنے امتحان پاس کر چکے ہیں، گھر جا رہے ہیں۔ تم سب کو اب کچھ بھی نہیں معلوم، تم گھر جاتی ہو، ابا تمھارے منتظر ہیں اور تمھارے چھوٹے بھائی گلا پھاڑ کر چیختے ہیں اور تمھارے بال کھینچتے ہیں۔ تمھاری کوشش سے وہ چین سے بیٹھ جاتے ہیں اور تم ابا کی ڈھارس بندھاتی ہو۔

جلد ہی لمبے لمبے دنوں والی گرمیاں آجاتی ہیں۔ جلد ہی تمھاری امی فوت ہو جاتی ہیں۔ تم اور تمھارے ابا دونوں انھیں قبرستان سے لے آتے ہیں۔ تین دن وہ چڑ چڑاتی موم بتیوں کے درمیان پڑی رہتی ہیں جیسے اس وقت تم پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے جاگنے سے پہلے ساری موم بتیاں بجھا دو۔ لیکن وہ موم کی بو سونگھ لیتی ہیں اور بانہوں کے سہارے اٹھ بیٹھتی ہیں اور دھیمے لہجے میں اسراف کا گلہ کرتی ہیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور اپنے کپڑے بدلتی ہیں۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تمھاری امی فوت ہو گئیں کیوں کہ تم اکیلی جان اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ زیادہ دیر کام نہیں چلا سکتی تھیں۔ لیکن اب وہ آ گئی ہیں۔ اب انھوں نے سارے کام سنبھال لیے ہیں اور وہ تمھیں اور اچھا کھیلنا سکھاتی ہیں۔ یہ ایسا کام ہے جس میں جتنی بھی مہارت حاصل ہو جائے کم ہے۔ یہ فن آسان نہ سہی لیکن سب سے مشکل بھی ہرگز نہیں۔

سب سے مشکل کام، بہرحال، ابھی باقی ہے۔ یہ بھول جانا کہ بولتے کیسے ہیں اور پیروں چلنے کے گر کو فراموش کرنا اور بے بسی کے عالم میں غوں غاں کرنے اور فرش پر رینگتے پھرنے کو اور سب سے آخر میں پوتڑوں میں لپیٹے جانے کو۔ سب سے مشکل بات اس ساری مامتا کو سہنا اور ٹکر ٹکر دیکھتے رہ جانا۔ صبر سے کام لو، جلد ہی سب کام سنور جائے گا۔ خدا کو اس دن کا علم ہے جب تم محض جانِ ناتواں ہوگی۔

یہ تمھاری پیدائش کا دن ہے۔تم دنیا میں آتی ہو اور اپنی آنکھیں کھولتی ہو۔اور تیز روشنی کی وجہ سے انھیں دوبارہ میچ لیتی ہو۔روشنی تمھارے اعضا کو گرماتی ہے،تم دھوپ میں انگڑائی لیتی ہو۔تم وہاں موجود ہو،تم جی رہی ہو۔تمھارے ابا تمھارے اوپر جھکے ہوئے ہیں۔

”ختم شد!“ وہ تمھارے پیچھے کھڑے کہتے ہیں۔”مرگئی۔“

چپ! انھیں اپنی کہنے دو!



کاریل چاپیک

پانچ روٹیاں

...مجھے اس سے کیا شکایت ہے؟ بھائی پڑوسی، میں تمھیں صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔ بات یہ نہیں کہ مجھے اس کی تعلیمات پر کوئی اعتراض ہے۔ قطعاً نہیں۔ میں نے ایک بار اسے تبلیغ کرتے سنا تھا اور تمھیں بتاؤں، میں آپ اس کے مریدوں میں شامل ہونے سے بال بال بچا۔ اجی میں گھر گیا اور میں نے اپنے چچیرے بھائی سے، وہی جو گھوڑوں کا ساز بناتا ہے، یہ کہا: سن بے، تجھے اس کی باتیں سننی چاہییں۔ میں تجھے بتا رہا ہوں، وہ اپنے طور سے پیغمبر ہی ہے۔ وہ بڑی پیاری پیاری باتیں کرتا ہے، اور باتیں بھی ایسی کہ نپٹ سچی۔ سن کے سینے میں دل اُلٹ جاتا ہے۔ اجی خود میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور مجھے یہی بہتر معلوم ہونے لگا کہ اپنی دکان بڑھا کے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑوں تاکہ وہ کبھی میری نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اس نے کہا، جو کچھ تمھارے پلے ہے سب خیرات کردو اور میرے پیچھے ہولو۔ اپنے پڑوسی سے محبت کرو، غریبوں کو سہارا دو اور جنھوں نے تمھیں ستایا ہو انھیں معاف کردو، اور اسی طرح کی اور باتیں۔ میں تو ایک معمولی نانبائی ہوں لیکن جب میں نے اسے بولتے سنا تو مجھ میں ایسا عجیب سرور اور سوز جاگا کہ سمجھ میں نہیں آتا اسے کیسے بیان کروں۔ ایک طرح کا بوجھ مجھ پر تھا، ایسا کہ میں شاید نڈھال ہو کر زمین پر ڈھیر ہو جاتا اور رو پڑتا، اور اس کے ساتھ ہی میں نے خود کو ہلکا پھلکا اور شگفتہ محسوس کیا جیسے میرے کندھوں سے ہر بوجھ، سمجھے، میری تمام پریشانیوں اور آزمائشوں کا بوجھ، اتر گیا ہو۔ سو میں نے اپنے چچیرے بھائی سے کہا، ابے گاؤدی، تجھے اپنے اوپر شرم آنی چاہیے۔ جب سنو، تو مال کھینچنے اور مال مارنے کے بارے میں یہی گھٹیل الٹی سیدھی ہانکتا رہتا ہے کہ لوگ تیرے کتنے مقروض ہیں اور تیرے ذمے کتنا عشر اور ڈنڈ اور سود نکلتا ہے۔ تجھے چاہیے کہ جو کچھ تیرے پاس ہے وہ غریبوں میں بانٹ دے، اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ دے اور اس کے پیچھے ہولے۔

اور جہاں تک بیماروں اور آسیب زدوں کو شفا بخشنے کا تعلق ہے تو مجھے اس بارے میں بھی اس سے

کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ ایک عجیب اور غیر فطری قوت ہے لیکن جو بھی سہی، یہ تو ہر کسی کو پتا ہے کہ ہمارے اپنے طبیب اتائی ہیں اور جو رومی ڈاکٹر ہیں وہ بھی ان سے بہتر نہیں ہیں۔ ہمارا تمھارا روپیہ تو ضرور اینٹھ لیتے ہیں لیکن جب انھیں کوئی جاں بلب مریض دکھانے کو بلایا جائے تو محض کندھے جھٹک کر رہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذرا پہلے بلانا چاہیے تھا۔ ذرا پہلے! میری بیوی بیچاری دو سال سیلانِ خون میں مبتلا رہنے کے بعد فوت ہوئی۔ میں اسے ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے پھرا۔ تم سوچ نہیں سکتے میرا کتنا روپیہ اٹھ گیا اور کیا مجال جو کسی کے ہاتھوں اسے ذرہ برابر بھی افاقہ ہوا ہو۔ اگر وہ اُن دنوں یوں شہر شہر گھوم رہا ہوتا تو میں اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک جاتا اور کہتا: مولا، اس عورت کو تندرست کر دیجیے! اور وہ اس کے دامن کو چھوتی اور چنگی بھلی ہو جاتی۔ بیچاری نے اتنی مصیبت جھیلی، میں بیان نہیں کر سکتا۔ سو میں اس بات کے حق میں ہوں کہ وہ بیماروں کو تندرست کر دیتا ہے۔ پتا ہے، ڈاکٹروں نے اس کے خلاف طوفان اٹھا رکھا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ یہ سب فریب اور ٹھگی ہے اور اگر ان کا بس چلتا تو اسے علاج کرنے سے روک دیتے اور نہ جانے اور کیا کیا کرتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس معاملے میں طرح طرح کے مفادات خلط ملط ہیں۔ جو آدمی بھی عوام کی مدد کرنا اور دنیا کو نجات دلانا چاہتا ہے اسے ہمیشہ کسی نہ کسی کے مفادات سے پنجہ لڑانا پڑتا ہے۔ ہر کسی کو تو خوش کیا نہیں جا سکتا، یہ ممکن ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسے بیماروں کو تندرست کرنے دو، بلکہ چاہے تو مُردوں کو بھی زندہ کر دے۔ لیکن وہ جو پانچ روٹیوں والا معاملہ ہے، اس قسم کی حرکت اسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بطور نانبائی میں یہ کہتا ہوں کہ یہ نانبائیوں کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔

تم نے پانچ روٹیوں والا واقعہ نہیں سنا؟ حیرت ہے! نانبائی تو سارے اس واقعے کی وجہ سے بالکل آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔ خیر، کہتے ہیں کہ ایک جم غفیر اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اُجاڑ بیابان میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے ان لوگوں میں جو روگی تھے انھیں شفا دی اور جب شام ہو گئی تو اس کے حواری پاس آ کے کہنے لگے، ''یہ اجاڑ بیابان ہے اور وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ اس مجمعے کو یہاں سے رخصت کر دیجیے تاکہ یہ دیہات میں جا کر اپنے لیے آذوقہ خرید لیں۔'' لیکن اس نے حواریوں سے کہا، ''انھیں یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں۔ تم انھیں کھانا کھلاؤ۔'' اس پر وہ بولے، ''ہمارے پاس تو یہاں کلہم پانچ روٹیاں اور دو مچھلیاں ہیں۔'' اس نے کہا، ''روٹیاں اور مچھلیاں میرے پاس لے آؤ۔'' اور اس نے مجمعے کو حکم دیا کہ گھاس پر بیٹھ جائے اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں اٹھائیں اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر برکت چاہی، لقمہ توڑا اور روٹیاں حواریوں کو تھما دیں اور حواریوں نے مجمعے میں بانٹ دیں اور ان سب نے روٹی کھائی اور رَج گئے اور پھر انھوں نے بچے کھچے ٹکڑے اکٹھے کیے تو ان سے بارہ چنگیریں پوری کی پوری

بھر گئیں اور جن مردوں نے وہاں روٹی کھائی وہ تعداد میں تقریباً پانچ ہزار تھے۔ عورتیں اور بچے اس کے علاوہ تھے۔

تم جانو، بھائی پڑوسی، یہ معاملہ ہی ایسا ہے کہ کوئی نانبائی اس کی تاب نہیں لاسکتا۔ تاب لائے کہاں سے؟ اگر یہی دستور چل نکلا کہ جس کا جی چاہا، پانچ روٹیاں اور دو پدّی سی مچھلیاں لے کے پانچ ہزار آدمیوں کو کھانا کھلا دیا تو پھر نانبائیوں کا کیا بنے گا، مجھے یہ بتاؤ؟ مچھلیوں کی تو خیر ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ آپ ہی آپ پانی میں پلتی بڑھتی رہتی ہیں۔ جس کا جی چاہے جا کے انھیں پکڑ لائے۔ لیکن نانبائی کے پاس اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ مہنگے داموں آٹا اور بالن خریدے، کام بٹانے کے لیے کسی کو نوکر رکھے اور اسے تنخواہ دے۔ اس کی اپنی دکان بھی ہونی چاہیے۔ اسے ٹیکس بھی بھرنا پڑتا ہے اور الم بھی کرنا ہوتا ہے اور غلم بھی کرنا ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ بھگت بھگتا چکنے کے بعد اگر چند پیسے بچ رہیں تو وہ یہی دیکھ کر خوش ہولیتا ہے کہ چلو بھیک مانگ کر کھانے کی نوبت تو نہیں آئی۔ اور وہ... بس نظر اٹھا کے آسمان کو تکا اور پانچ ہزار یا خدا جانے کتنے ہزار آدمیوں کے لیے روٹیاں موجود۔ نہ آٹے کا کوئی مول دینا، نہ کالے کوسوں سے بالن منگوانا، نہ کوئی خرچ، نہ محنت۔ ہاں جی، وہ بے شک لوگوں کو مفت روٹی کھلا سکتا ہے! اور اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ وہ آس پاس کے نانبائیوں کو ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے محروم کیے دے رہا ہے۔ میں تم سے کہے دیتا ہوں، یہ ناجائز کاروباری مقابلہ ہے اور اسے اس کام سے باز رکھنا چاہیے۔ اگر اسے تندور چلانے کا شوق ہے تو ہماری طرح ٹیکس دیا کرے۔ لوگ ہمارے پاس آ کے کہتے ہیں: یہ کیا! اس سڑیل سی ٹکیا کے اتنے زیادہ دام؟ تمھیں چاہیے کہ یہ تو اُس کی طرح مفت میں دیا کرو۔ اور لوگ بتاتے ہیں، اس روٹی کا کیا کہنا: سفید اور پھول سی اور خوشبودار۔ جی چاہتا ہے کھائے ہی چلے جاؤ۔ اب حالت یہ ہے کہ ہمیں اپنی قیمتیں گرانی پڑی ہیں۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ہم صرف اس لیے روٹی لاگت سے بھی کم داموں میں بیچ رہے ہیں کہ کہیں دکان ہی نہ بڑھانی پڑ جائے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو نانبائیوں کے کاروبار کا تو پلیتھن نکلا ہی سمجھو۔ میرے سننے میں آیا ہے کہ ایک اور مقام پر اس نے سات روٹیوں اور چند ایک مچھلیوں سے چار ہزار مردوں کو کھانا کھلایا۔ عورتیں اور بچے اس تعداد میں شامل نہیں۔ لیکن اس بار روٹی کے ٹکڑوں سے صرف چار چنگیریں ہی بھریں۔ اس لیے شاید اس کا کاروبار بھی کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہو رہا۔ مگر اس نے ہم نانبائیوں کا کام تو ہمیشہ کے لیے چوپٹ کر دیا ہے۔ اور مجھ سے یہاں اب یہ بھی سن لو کہ یہ سب اس نے اس لیے کیا کہ اسے نانبائیوں سے بیر ہے۔ مچھیرے بھی اس کی وجہ سے دہائی دیتے پھر رہے ہیں۔ لیکن تمھیں پتا ہی ہے کہ وہ مچھلیاں کس قدر مہنگی بیچتے ہیں۔ لوٹ مچائی ہوئی ہے انھوں نے۔ ان کی نسبت ہمارا کاروبار ذرا زیادہ کھرا ہے۔

دیکھو جی، بھائی پڑوسی، میں تو محض بوڑھا آدمی ہوں اور ہوں بھی دنیا میں اکیلا۔ نہ بیوی ہے نہ بچے۔ سو مجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟ میں نے اپنے نوکر سے کہہ دیا کہ میری دکان تو لے لے اور خود ہی چلا۔ مجھے اپنا کام چکانے کی کوئی فکر نہیں۔ میں نے کہا، جی تو میرا سچ مچ یہی چاہتا ہے کہ جو نام چار کو آدھی پونی جائیداد میرے پاس ہے وہ بانٹ چونٹ دوں اور اس کے ساتھ ہولوں، اور اپنے پڑوسی سے پیار کرنے کی عادت ڈالوں اور وہ سارے کام کر گزروں جن کا وہ پرچار کرتا پھرتا ہے۔ لیکن جب مجھے اس سلوک کا خیال آتا ہے جو اس نے نانبائیوں سے روا رکھا ہے تو میں اپنے آپ سے کہتا ہوں: اونہوں، یہ نہیں! بطور نانبائی مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ یہ دنیا کی مغفرت نہیں بلکہ ہمارے دھندے کا پورا پورا ستیاناس ہے۔ مجھے افسوس ہے مگر میں اسے یہ سب کچھ بے دھڑک کر گزرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ بات ہی غلط ہے۔

بے شک ہم انانیاس اور گورنر دونوں کے یہاں اس کے خلاف یہ شکایت درج کرا چکے ہیں کہ وہ کاروبار میں رخنہ ڈال رہا ہے اور بغاوت پر اکساتا پھرتا ہے۔ لیکن تمھیں پتا ہی ہے کہ حکام کوئی قدم اٹھاتے اٹھاتے کتنی دیر لگا دیتے ہیں۔ تم تو مجھے جانتے ہو، بھائی پڑوسی، میں صلح کل آدمی ہوں اور مجھے کسی سے جھگڑا مول لینے کا شوق نہیں۔ لیکن اگر اس نے یروشلم میں قدم رکھا تو میں بیچ سڑک میں کھڑے ہو کر پکار پکار کر کہوں گا: ”چڑھا دو سولی پہ اسے! چڑھا دو سولی پہ!“

میلووان جیلاس

جنگ

مشرق سے مغرب کو بہتا ہوا بڑا دریا اپنے سے بھی بڑے دریا میں جا ملتا تھا۔ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا کہ جو دریا ذرا چھوٹا ہو وہ اپنے سے بڑے دریا میں مل جاتا ہے۔ سبھی دریاؤں کی طرح ان دو دریاؤں کے اردگرد بھی سدا سے جنگیں اور لڑائیاں ہوتی آئی ہیں، سرحدیں کھنچتی رہی ہیں، کیوں کہ زندگی دریاؤں کے جلو میں چلتی ہے اور یہ دریا ہی ہیں جو حسبِ اتفاق، وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق، انسانوں کو جدا یا متحد کرتے چلے آئے ہیں۔

اس بڑے دریا کے آس پاس تین مہینے سے جنگ لڑی جا رہی تھی۔ لیکن چونکہ فریقین کی افواج یکساں تھیں اس لیے ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ خاص طور پر سردی کا موسم آ جانے پر تو یہ ممکن ہی نہ رہا تھا کیوں کہ جاڑے میں جارحانہ حملے کے لیے زیادہ نفری اور ساز و سامان درکار ہوتا ہے۔ کناروں کے ساتھ ساتھ اور دو آبے میں فوجوں نے خندقیں کھود لیں۔ اپنی فوجی طاقت کو مجتمع کیا تاکہ موسم بہار میں، جب برف پگھلنی شروع ہو اور کونپلیں پھوٹنے لگیں تو وہ ایک دوسرے کو تباہ کر سکیں۔ محاذ ایک بڑے دریا کو کاٹتا ہوا گزر رہا تھا، لیکن اَور دریاؤں کی طرح اس دریا کو بھی اس بات سے کیا فرق پڑتا تھا کہ کوئی محاذ اسے کاٹ کر گزر رہا ہے۔ وہاں سے محاذ جنوب اور جنوب مشرق کی طرف پھیلا ہوا تھا جہاں وہ دوسرے اور زیادہ بڑے دریا کو چھو کر اس کے کنارے کنارے چلتا گیا تھا۔ دریا کوئی سا بھی ہو، اسے کیا پروا کہ اس کے کنارے لڑائیاں ہوتی ہیں یا نہیں۔ خندقوں، زیر زمین مورچوں اور ہر طرح کی کھدائیوں سے چاک چاک محاذ کیا تھا زمین کی بمشکل تیس میل چوڑی ایک پٹی تھی جس نے بڑے اور چھوٹے دریا دونوں کو آغوش میں لے رکھا تھا۔ زمین کو بھی اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ محاذ اس پر سے ہو کر گزر رہا تھا یا نہیں گزر رہا تھا۔ چراگاہیں اور تاکستان، دیہات اور قصبے بھی محاذ کے ہونے یا نہ ہونے سے بالکل بے تعلق تھے۔

لیکن دریا کے کناروں پر رہنے سہنے والے لوگ محاذ کی طرف سے بے پروا کیسے رہتے، گو جنگ کے لیے انھیں مورد الزام نہیں ٹھیرایا جاسکتا تھا۔ وہاں کی مٹی اور دھوپ انسانوں کے حق میں اچھی تھی اور انسان وہاں آباد تھے۔ جنگ کا مطلب ہے انسانوں اور ان کی زندگیوں پر جبر و تشدد اور آقائی، اور انسانی زندگی جہاں بھی ہو جنگ اسے درہم برہم کرنے سے باز نہیں آسکتی۔ اگر وہ لوگ وہاں نہ بھی آباد ہوتے تو بھی جنگ قرب و جوار میں پہنچتے ہی ان کی ساری زندگی تلپٹ کر کے رکھ دیتی۔

چوں کہ جنگ میں دو فوجوں کا آمنے سامنے ہونا ضروری ہے — کیوں کہ ان کے بغیر جنگ کیسے ہو — اس لیے دونوں کی حتی الوسع یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر اس چیز کو ملیا میٹ کر دیں جو شاید حریف کے کسی کام آسکتی ہو۔ جنگ میں کوئی انسانی شے، انسانی ذہانت یا کاری گری کی ساختہ پرداختہ کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو دشمن کے لیے تقویت کا باعث نہ ہوسکتی ہو۔ لہٰذا حریف کو کمزور کرنے کا سب سے تیر بہدف طریقہ یہ ہے کہ ہر اس چیز کو تباہ کر دیا جائے جو حریف کے کسی کام آسکتی ہو۔ جنگ سوجھ بوجھ سے عاری ہوتی ہے۔ وہ کسی خاص وقت پر یہ تعین بھی نہیں کرسکتی کہ کون سی چیز مدمقابل کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی ہے، کون سی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جنگ میں سب سے عقل مندی کی بات یہ ہے کہ ہر چیز کو تباہ کر دیا جائے — گھروں اور کھیتوں کو، مویشیوں اور سڑکوں کو، پلوں اور عجائب گھروں کو — اور فطری طور پر سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے، اور سب سے زیادہ اہمیت بھی اس کو حاصل ہے، کہ انسانوں اور ان کے رہن سہن کے طور طریق کی ایسی تیسی کر دی جائے۔

مغرب کی طرف پسپا ہوتے وقت دشمن نے دریا پر بنے ہوے تمام پل توڑ دیے تھے اور تمام کشتیاں تباہ کر دی تھیں۔ اس نے اتنی چھوٹی چھوٹی اور بے بضاعت کشتیوں تک کو نہ بخشا تھا جن میں پریمیوں کا کوئی جوڑا بھی مشکل سے سما سکتا تھا۔ اور چوں کہ وہ محبت میں گرفتار ہوتے ہیں اس لیے ایک دوسرے کو زور سے لپٹائے رکھنا چاہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بچا لینا چاہتے ہیں۔ محاذ کے قریب کہیں بھی، اور محاذ سے بہت دور دور تک بھی — کیوں کہ محاذ کا کیا ہے، آج یہاں تو کل وہاں — کوئی پل، مسافر بردار کشتی یا لٹھوں کا بنا بیڑا اسلامت نہ تھا۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ ان کشتیوں اور ڈونگیوں تک کو جنھیں مچھیروں نے پیش قدمی کرنے والی فوج سے چھپا لیا تھا، پسپا ہونے والی فوج نے بحق سرکار ہتھیا لیا تھا۔ ہتھیاتے وقت یہ خیال تو کم تھا کہ شاید وہ اس کے اپنے کسی مصرف میں آسکیں اور یہ فکر زیادہ دامن گیر تھی کہ وہ کہیں دشمن کے کسی کام نہ آجائیں؛ کہیں وہ ان کی مدد سے جاسوسوں یا لوگوں کو بھڑکانے والے ایجنٹوں کو پار نہ اتار دیں یا کہیں، اتفاقاً، اسے دوبارہ پیش قدمی نہ کرنی پڑ جائے۔

مگر انسانوں کو تو جنگ میں بھی، اور جنگ کے باوجود بھی، جیے جانے کے سوا چارہ نہیں، اور اس

لیے انھوں نے محاذ کے عقب میں دریا عبور کرنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ ان کے پاس کشتی بنانے کا ساز و سامان تو کوئی تھا نہیں اور چونکہ وہ لوگ سمجھ دار تھے اس لیے انھیں پتا تھا کہ ہر نئی کشتی یا مسافر بردار کشتی کو بحق سرکار ہتھیا لیا جائے گا، لہٰذا ان کی تمام آمد و رفت فوجی موٹر کشتیوں کے ذریعے سے تھی کیوں کہ فوج کے پاس لازمی طور پر دریا پار کرنے کے ذرائع ہونے چاہییں، اور تھے بھی۔ فوج تو صرف اس لیے وجود رکھتی ہے کہ اس کے پاس ہر وہ چیز ہو جو حریف کے پاس ہے اور وہ چیز بھی ہو جو حریف کے پاس نہ ہو اور حتیٰ کہ وہ چیز بھی ہو جس کے بارے میں گمان ہو کہ حریف کے پاس ہو سکتی ہے۔

موٹر کشتی پر متعین فوجی بھلے مانس تھے۔ تمام فوجی جب وہ فوجی نہ ہوں تو بھلے مانس لگتے ہیں، حتیٰ کہ اس وقت بھی بھلے مانس ہی نظر آتے ہیں جب وہ فوجی تو ہوں لیکن جنگ میں مصروف نہ ہوں۔ وہ اپنی موٹر کشتیوں میں لوگوں اور ان کے مویشیوں کو اور ہر چیز کو مفت دریا پار کراتے رہتے تھے۔ وہ اس بنا پر اور بھی لحاظ کرتے تھے کہ خود بھی اسی علاقے کے لوگوں سے نسبت رکھتے تھے جس کے لیے جنگ لڑی جا رہی تھی۔ لوگوں اور ان کے سامان کو اِدھر سے اُدھر ڈھونے کا کام وہ صرف اس وقت کرتے جب کشتی فوج کے لیے یا جنگی مقاصد کے لیے استعمال نہ ہو رہی ہوتی — اور یہ بالکل فطری تھا کیوں کہ ان کی وہاں موجودگی، اپنے فرائض کی انجام دہی اور ان کا فوجی ہونا، سب جنگ کی بدولت تھا۔

دشمن کے طیارے دن کے وقت پرواز کرنے کو ترجیح دیتے تھے، اس لیے کشتی فوج کے واسطے رات کو اور عوام کے لیے بالعموم دن کو چلتی تھی۔ لیکن لوگ، گو وہ فوج میں نہیں تھے، جلد ہی اس بات سے آگاہ ہو گئے اور دن کے وقت گھاٹ سے دور رہنے لگے۔ وہ گھاٹ پر زیادہ تر شام کو اکٹھے ہوتے۔ اس وقت تک دشمن کے طیارے اپنا آنا جانا موقوف کر چکے ہوتے تھے اور ان کی اپنی فوج کی نقل و حمل شروع ہونے میں ذرا سی دیر ہوتی تھی؛ یا پھر وہ منھ اندھیرے، دشمن کے طیاروں کی پرواز شروع ہونے سے پہلے اور اپنی فوج کی آمد و رفت ختم ہونے کے بعد، گھاٹ پر آ پہنچتے۔

اس پوری صبح، جو اتنی ہی پھیکی سیٹھی اور ٹھٹھری اور سیلی ہوئی تھی جتنی کہ جاڑوں کی بیشتر صبحیں ہوا کرتی ہیں، دریا کے بائیں کنارے سے، جدھر محاذ تھا، رونے پیٹنے کی آواز آتی رہی تھی۔ کنارے پر تعینات فوجیوں اور تینوں افسروں کو — جاسوسوں کا توڑ کرنے والے شعبے کا ایک میجر، اس کا نائب جو ایک کیپٹن تھا اور ایک لفٹنٹ جس نے گھاٹ اور کشتیوں کی آمد و رفت کا انتظام سنبھال رکھا تھا — پتا تھا کہ کسانوں میں سے کوئی آہ و زاری کر رہا تھا۔ صرف کسان ہی، جب وہ محاذ سے بھائی یا باپ کی لاش لے کر آتے، اس قدر لگاتار اور زور زور سے اور بغیر کسی تُک کے بَین کرتے تھے۔ اگر لاش بیٹے یا شوہر کی ہوتی تو اور بھی زیادہ ماتم ہوتا تھا۔ افسر تو جھٹپٹا ہونے سے بھی پہلے ان بدنصیبوں کو دریا پار کرانے میں مدد

دینے کے لیے تیار تھے مگر انھوں نے کشتی کو بید کے درختوں کے نیچے چھپا رکھا تھا کیوں کہ دشمن کے قراولی طیارے دن بھر، گھڑی گھڑی، بادلوں میں سے نمودار ہوتے رہتے تھے جیسے انھیں دریا کو دیکھنے میں لطف آتا ہو۔ دریا نہ تو نیلا تھا نہ رو پہلا بلکہ گدلا تھا اور بیدوں کے جھنڈ، جو اندھیری، گلی سڑی دلدل میں ڈوبے ہوئے تھے، اندھیرے، بوجھل آسمان میں گھل مل گئے تھے۔

بھک بھک کرتی موٹر کشتی پہلے ہی دلدل سے باہر لائی جا چکی تھی۔ سر پر جھکے ہوئے کالے بادل پانی کی عین لگر تک چھائے ہوئے تھے اور جھٹپٹا پھیلنے لگا تھا۔ لہٰذا افسروں نے فیصلہ کیا کہ طیاروں سے اب کوئی مزید خطرہ نہیں رہا۔

بین، جو تھم گئے تھے، یکا یک دوبارہ شروع ہو گئے جیسے وہ موٹر کے خاموش ہونے اور کنارے سے کشتی کے ماتھا رگڑنے کے منتظر تھے۔ کسان مردوں عورتوں کا ایک ہجوم، اپنے مویشیوں سمیت، کشتی پر آ چڑھا۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کا باریش کسان تھا جو منھ ہی منھ میں بڑبڑا کر اپنے جیوٹ گھوڑوں کو کشتی پر چڑھ جانے پر اکسا رہا تھا۔ وہ اسی قسم کے جملے بول رہا تھا جنھیں وہ گھر پر بولنے کا عادی تھا مگر اس کا لہجہ زیادہ دھیما اور زیادہ اداس تھا کیوں کہ ریہڑے پر چیڑ کی لکڑی کا، بغیر روغن کا، تابوت لدا ہوا تھا۔ تابوت پر ایک کسان عورت نے، جو خود بھی ادھیڑ عمر کی تھی اور منھ پر آنکھوں تک رومال سے ڈھاٹا باندھے ہوئے تھی، ایک ہڈیلا ہاتھ رکھا ہوا تھا جیسے اسے یہ ڈر ہو کہ کہیں تابوت سے جدا نہ ہو جائے۔

''آ، میرے غم، میرا دکھ اٹھا کر میرے اجڑے گھر تک لے چل،'' کسان باگ کو ذرا سا جھٹکا دے کر منھ ہی منھ میں بڑبڑایا۔ ادھر کسان عورت بین کرتی ہوئی اور کہیں زیادہ دکھ بھرے الفاظ بول بول کر دوسرا ہاتھ بھی بڑھا کر تابوت سے لپٹ گئی۔

کیپٹن نے، جو گورا، فاقہ زدہ اور گٹھے ہوئے جسم کا تھا— وہ بالکل مختلف بھی نظر آ سکتا تھا کیوں کہ وہ صرف اسی لیے اہم تھا کہ کیپٹن تھا— تقریباً غصے میں آ کر کشتی پر سوار ہونے والوں کو ڈانٹا۔ ان سے کہا کہ وہ ریہڑے کے لیے جگہ خالی کریں۔ یہی نہیں بلکہ خود کنارے پر کود گیا، باگ تھام لی اور زور لگا کر گھوڑوں کو کشتی پر لے آیا۔ ''یہ کام مجھ پر چھوڑ دو، چچا۔ میں گھوڑوں کے ساتھ ہی پلا بڑھا ہوں۔ اے تم! جگہ چھوڑو۔''

گھوڑوں نے طاقتور اور حاکمیت والے ہاتھ کو پہچان لیا اور لگام کو چباتے ہوئے، کیپٹن کے پیچھے پیچھے چلے آئے اور اپنے سُموں سے تختوں کا ٹھوس پن اور ان کے نیچے کی گہرائی کو آزمانے لگے۔ کسان نے کیپٹن کا شکریہ ادا کیا اور اسے اور پوری فوج کو دعائیں دیں۔ کسان عورت نے بھی، زیادہ دبی اور کہیں زیادہ دکھ بھری نوحہ گری کے ساتھ، اس کی تائید کی۔ بظاہر کیپٹن اس قدر اظہارِ ممنونیت سے کھسیا سا

گیا۔ اپنے ہاتھوں کو اس طرح ملتے ہوئے جیسے انھیں رگڑ رگڑ کر مٹی اتارنی مقصود ہو — اور حقیقت یہ ہے کہ باگ چکنی اور کیچڑ میں سنی ہوئی تھی — اس نے مسکینی اور انکسار سے کام لے کر اظہار ممنونیت کو مسترد کیا۔ ''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، چچا۔ لوگوں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم یہاں اور کس لیے ہیں۔ لیکن یہ تم، اس تابوت میں، کسے لے جا رہے ہو؟''

''کسے؟'' کسان نے دکھ بھرے انداز میں حیران ہو کر کہا۔ ''آج کا دن میرے لیے منحوس ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے، اکلوتا بیٹا۔ دو کی پہلے ہی بھینٹ دے چکا ہوں اور اب اس کی باری آگئی ہے۔ اس کو لے چلا ہوں۔''

صاف ظاہر تھا کہ کیپٹن کوئی ایسی بات کہنا چاہتا تھا جو مرہم کا کام بھی دے جائے اور ساتھ ہی ساتھ ہمدردانہ بھی ہو، کوئی ایسی بات جیسے ''ہاں، آزادی کی بڑی بھاری قیمت دینی پڑتی ہے!'' لیکن اسے صحیح الفاظ نہ مل سکے، یا شاید اسے یہ محسوس ہوا ہو کہ وہ کسانوں کے دکھ درد کے سامنے سطحی معلوم ہوں گے۔ عورت بلاشبہ مرنے والے کی ماں تھی۔ چنانچہ وہ خاموش رہا اور آہ بھر کر رہ گیا۔ لیکن اس کے بجائے لفٹنٹ، جو سکان پر کھڑا تھا، بول پڑا۔ وہ بھی گورا چٹا مگر قد آور تھا اور اس کی مونچھیں اتنی چھدری اور ہلکے رنگ کی تھیں کہ ان کا مصرف اس کے گنجے پن کو نمایاں کرنے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ بھی شاید مختلف نظر آتا کیوں کہ وہ بھی محض اس لیے اہم تھا کہ لفٹنٹ تھا۔ ''کوئی کرے تو کیا کرے؟ جنگ جنگ ہے۔ روز آدمی مرتے ہیں۔ بعض دفعہ ہماری کشتی پر زندہ آدمی کم اور مُردے زیادہ ہوتے ہیں۔''

ایک لمبے، دبلے پتلے، ادھیڑ عمر کے جھریائے ہوئے کسان نے باپ کو مخاطب کر کے پوچھا، ''کیا تم محاذ سے اپنے بیٹے کی میت لے کر آ رہے ہو؟''

کسان نے اسے بتایا کہ وہ محاذ پر اپنے بیٹے سے ملنے گیا تھا اور اس کے لیے صاف کپڑے اور کھانا لے گیا تھا۔ وہ خود بھی ایک جنگ میں حصہ لے چکا تھا اور اسے اچھی طرح علم تھا کہ فوجیوں کو کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرسوں صبح دشمن نے حملہ کیا اور شومیِ قسمت سے اس کا نوجوان، ناتجربہ کار بیٹا، جو ابھی بیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا، توپ کا گولا لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ ''اس کی ساری انتڑیاں باہر آ گئیں، اور نہ اس کا باپ اور نہ اس کی ماں وقت پر اس کے پاس پہنچ پائے کہ اس کی آخری خواہش ہی معلوم کر سکتے۔'' اس نے یہ جملہ اس طرح ادا کیا جیسے اپنے آپ سے اور اپنی بیوی سے باتیں کر رہا ہو، مگر اس کا انداز زیادہ یاس انگیز تھا۔

اور ماں نے اپنا بین اس جملے پر ختم کیا، ''ہم تمھیں کیا بتائیں؟ یہ ہمارا اپنا جنازہ ہے۔ ہماری نسل ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔''

دبلے پتلے کسان نے، اپنی سوکھی سڑی گردن کے کنٹھ سے کھیلتے ہوئے، اس طرح بات جاری رکھی جیسے اس نے باپ اور ماں کی باتیں سنی ہی نہ ہوں۔ ''میرا بیٹا بھی مہینہ بھر پہلے مارا گیا تھا لیکن میں اس کی لاش نہیں لایا۔ میں نے کہا کہ اسے اپنے ساتھیوں کے پہلو ہی میں دفن کر دو۔ لیکن تم، تمھیں محاذ پر تابوت کہاں سے ہاتھ آ گیا؟ وہاں نہ تو لکڑی ملتی ہے اور نہ بڑھئی ہیں — کچھ بھی تو نہیں ہے!''

باپ نے اس طرح منھ موڑ لیا جیسے آخری سوال سنا ہی نہ ہو۔ ''اور مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ ہم اسے لے کہاں چلے ہیں۔ یہ محض ہماری کسانوں والی احمقائی ہے کہ دل کو تسلی دینے کے لیے اور نہیں تو گور گڑھا ہی سہی۔''

کیپٹن نے کہا کہ اور لوگ بھی اپنے پیاروں کی میت لے کر آتے رہے ہیں، گو ان میں سے کسی نے تابوت کا تکلف بے شک نہیں کیا تھا۔ ''عوامی فوج کی کمان ہمارے رسم و رواج کا احترام کرتی ہے، مگر سچ پوچھو تو فوجی کے لیے فوجیوں کے پہلو ہی میں دفن ہونا مناسب ہے۔''

کشتی نے کنارے کو چھوا، گھوڑوں نے جھرجھری لی۔ کیپٹن نے دوبارہ باگ تھام لی اور گھوڑوں کو لے چلا جو اَب خوشی خوشی چل پڑے کہ ان کے سم ٹھوس مٹی کو چھونے کے لیے بے چین تھے۔

دریا کے بند کے ساتھ ساتھ ایک پگ ڈنڈی تھی اور فوج نے اتارے کے آگے کیچڑ اور پانی سے بھرے اتھلے گڑھوں کے بیچ میں ایک سڑک بنا کر بجری بچھا دی تھی۔ مسافر اس چھوٹی اور تنگ سڑک کے ساتھ ساتھ، جس کے دائیں بائیں پہیوں کا روندا ہوا پتلا گارا جمع تھا، ایک دوسرے کے پیچھے قطار بنا کر کھڑے ہونے لگے۔ وہ اپنے کاغذات میجر کو دکھانے کے لیے تیار تھے جو سڑک کے کنارے بنے ہوئے چھوٹے سے جھونپڑے سے ابھی باہر نہیں آیا تھا۔ کیپٹن، اس بات پر کوئی توجہ دیے بغیر کہ قطار میں اسے کس جگہ پر ہونا چاہیے، گھوڑوں کو لیے آگے بڑھتا گیا۔ لوگ بادلِ ناخواستہ راستہ چھوڑ کر گارے میں جا کھڑے ہوئے لیکن انھوں نے کوئی احتجاج نہیں کیا کیوں کہ ایسا انھیں ایک میت کی خاطر کرنا پڑا تھا؛ پھر طرہ یہ کہ میت کو خود ایک افسر لیے جا رہا تھا۔ مگر وہ دبلا پتلا کسان — وہی جس کا بیٹا ایک مہینے پہلے کام آ چکا تھا — دھکا پیل کرتا آگے بڑھتا اور دائیں ہاتھ میں پکڑی لاٹھی کو یوں گھماتا رہا جیسے وہ تیز تیز چلنے میں ممد ثابت ہو رہی ہو اور کسی پر توجہ دیے بغیر ڈگ بھرتا ہوا جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔ مزید یہ کہ جب لفٹننٹ نے اسے سرزنش کی کہ وہ قطار میں رہے تو اس نے صرف مڑ کر دیکھا اور برابر تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اپنا بازو بے صبری سے ہلایا اور لاٹھی سے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر کے چیخا، ''مجھے وہاں بڑا ضروری کام ہے!''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی؛ صرف ریت پر چلتے ریہڑے کی روں روں اور کیچڑ میں چلنے والوں

کے قدموں کی غچا غچ سنائی دیتی رہی۔ سب سمجھ گئے تھے کہ دبلا پتلا کسان جھونپڑے میں میجر کو کوئی اہم بات بتانے گیا ہے۔

جہاں تک دبلے پتلے کسان کا تعلق ہے اس نے کوئی بات نہیں چھپائی اور جب ریڑھا بند پر پہنچا تو میجر اس کا منتظر تھا۔ میجر نے اشارے سے کہا کہ ریڑھے کو ایک طرف کھڑا کردیا جائے۔ کسان میجر کے پیچھے کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھ کر مکارانہ انداز میں مسکرا رہا تھا اور کبھی ایک پیر پر زور دے کر کھڑا ہو جاتا، کبھی دوسرے پر۔ وہ ڈینگ مارنے لگا۔ ''میں نے سن لیا تھا، مجھے آج پتا چل گیا تھا کہ اس تابوت میں کچھ فی ہے اور، کیپٹن صاحب، آپ ہرگز اس وجہ سے مجھ سے آزردہ نہ ہوں کہ میں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ تابوت کو کہیں دریا میں نہ لڑھکا دیں۔ میں انتظار کررہا تھا کہ دریا پار کرلیا جائے کہ پرلے کنارے پر زیادہ بڑے عہدے کی سرکار موجود ہے، اور تم لوگوں کو بھی مجھ پر غصہ نہ کرنا چاہیے،'' اس نے مڑکر والدین سے کہا۔ ''یہ ہمارا فرض ہے کہ جب ہمیں کوئی مشتبہ چیز نظر آئے تو دوٹوک بات کریں۔ جنگ آخر جنگ ہے۔''

ماں باپ گڑبڑا کر، ہکا بکا ہوکر رک گئے تھے۔ ماں کے اوسان پہلے بحال ہوئے اور وہ کسان کی کینہ توزی اور دروغ گوئی کو کوسنے اور میجر کی منت سماجت کرنے لگی۔ ''رحم کرو۔ آج کا دن تو ہمیں اپنے دکھ درد کے ساتھ گزار لینے دو۔''

ماں کے بولنے سے باپ کو بھی شہ ملی اور جوش آگیا۔ وہ بڑے آرام سے میجر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور التجا کرنے لگا۔ اس کا طرز تخاطب جتنا پُر استقلال اور سپاہیانہ تھا اتنا ہی عاجزانہ بھی تھا۔ ''کامریڈ میجر، کچھ خیال کریں۔ ہم ماں باپ ہیں۔ یہ ہمارا بیٹا ہے۔ ہمارا گاؤں بڑی دور ہے۔''

میجر شکل صورت سے نوجوانوں جیسا، سانولا اور بہت چوکس تھا۔ اس کے بشرے سے سرد مہری کی نسبت تجسس زیادہ ٹپکتا تھا۔ وہ بھی اگر میجر نہ ہوتا تو اور ہی طرح کا نظر آتا۔ اس نے کسان کو اس طرح جواب دیا جیسے وہ سامنے کھڑے آدمی کے بجائے کسی ایسے غیر موجود شخص سے مخاطب ہو جس کے بارے میں ضابطوں میں یہ طے کردیا گیا تھا کہ اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا لازم ہے۔ ''احکامات کی رو سے ہم ہر چیز کی تلاشی لینے پر مجبور ہیں۔ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

پھر وہ ریڑھے کے پاس گیا اور تابوت کو انگلیوں سے کھٹکھٹا کر حکم دیا کہ اسے کھولا جائے۔

فوجیوں نے پھرتی سے تعمیلِ حکم کی اور کسی خاص دقت کے بغیر ریڑھے پر سے تابوت اتارلیا۔

ماں تابوت پر لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ آہ وزاری کررہی تھی۔ ''میرا اجڑا گھر! میرا اجڑا گھر!''

لیکن فوجیوں کے پاس ایسی کوئی چیز نہ تھی جس سے ڈھکنا کھولا جاسکتا۔ اس بات سے باپ کا

حوصلہ بڑھا اور وہ پھر میجر کے آگے گڑگڑانے لگا۔ ''اپنی روح پر گناہ کا داغ نہ لگاؤ۔ کچھ خیال کرو۔''

ایسا لگتا تھا کہ میجر سن ہی نہیں رہا، اور وہ سن سکتا بھی نہیں تھا کیوں کہ مسافروں کے کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف تھا۔ اس کے باوجود اس نے باپ سے، اور شاید مسافروں سے بھی، کہا، ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

ایک ٹرک آیا اور میجر نے ہاتھ ہلا کر، جس میں اس نے کسی کے بہت سارے کاغذات تھام رکھے تھے، اسے روک لیا۔ کیپٹن کو پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، اور ڈرائیور سے ہتھوڑا اور زنبور مانگ لایا۔ اس نے نرمی سے ماں کو تابوت پر سے ہٹایا لیکن وہ دبک کر اور ازخود رفتہ سی قریب ہی بیٹھی رہی۔ اس کی سختی سے بند مٹھیاں چہرے کو بھینچے ہوئے تھیں اور وہ پہلے سے بھی زیادہ مایوسانہ انداز میں اپنے اجڑے گھر اور سیاہ بختی کا ماتم کر رہی تھی۔

فوجیوں نے فوراً ڈھکنے کے کیل نکال لیے اور میجر نے، جو کاغذات کا معائنہ ختم کر چکا تھا، حکم دیا کہ ڈھکنا اٹھایا جائے۔ تابوت میں ڈاڑھی مونچھ منڈا، کھتئی بالوں والا ایک نوجوان کسانوں جیسے کپڑے پہنے لیٹا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں مٹکائیں، اٹھنے کی ذرا سی کوشش کی، پھر جھینپ کر مسکرایا اور وہیں لیٹا رہا۔

''یہ تمھارا بیٹا ہے؟'' میجر نے پوچھا۔

''میرا بیٹا،'' کسان نے جواب دیا۔ ''میرے دو بیٹے پہلے ہی مارے جا چکے ہیں۔''

''بھگوڑا ہے؟'' میجر نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں۔ میں اسے بچانا چاہتا ہوں۔ اپنی نسل قائم رکھنے کے لیے۔ اگر میرا پورا خاندان ہی نابود ہو گیا تو میری زمین اور مکان اور جاگیر میرے کس کام کی؟'' کسان نے غیر جذباتی انداز میں جواب دیا۔

مسافر تجسس کے مارے رک گئے تھے لیکن میجر نے فوجیوں کو حکم دیا کہ انھیں چلتا کیا جائے اور وہ سب کے سب رائفلوں کے آگے تیزی اور بے ترتیبی سے پسپا ہو گئے۔ ڈرائیور بھی اپنے اوزار واپس ملتے ہی چلا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے ان تمام باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، یا شاید اسے زیادہ اہم کام کرنے تھے یا کوئی ذاتی پریشانیاں لاحق تھیں۔ صرف دبلا پتلا کسان وہیں ڈٹا رہا۔ اسے وہاں سے کسی نے بھگایا بھی نہیں اور وہ اس طرح کھڑا رہا جسے وہاں رکے رہنے کا کوئی خصوصی حق رکھتا ہو۔ اس نے تقریباً اپنے آپ سے کہا، ''اور میں یہ سمجھا تھا کہ اس میں کوئی جاسوس ہے یا ایسا ہی کوئی چکر ہے۔ میں کسی کا برا نہیں چاہتا تھا۔ خدا میری مدد کرے! خدا میری مدد کرے!''

تابوت کے پاس دبکی بیٹھی ماں نے نوجوان کے ماتھے سے، جو پسینے میں تر تھا، بال ہٹا کر

سلجھاتے ہوئے تسلی دی۔ ''ڈرو نہیں، میری جان! میجر صاحب اچھا آدمی ہے، اچھا آدمی ہے۔ اپنا ہی آدمی ہے، ہم لوگوں میں سے ہے۔''

ذرا حوصلہ ہوا تو نوجوان تابوت میں اٹھ بیٹھا لیکن میجر نے اشارے سے اسے کہا کہ دوبارہ لیٹ جائے۔ وہ اس طرح لیٹ گیا جیسے حکم کی تعمیل کر رہا ہو۔ اس پر اضطراب کا عالم تھا۔

''کیپٹن، اپنا فرض پورا کرو!'' میجر نے حکم دیا۔

کیپٹن جیسے اسی حکم کا منتظر تھا۔ اس نے فی الفور اپنا پستول کھینچ کر گھوڑا چڑھالیا۔ کسی حکم کا انتظار کیے بغیر لیفٹننٹ نے ماں کو بیٹے کے پاس سے ہٹانے کے لیے کندھوں سے پکڑا، درشتی سے گو کام نہیں لیا لیکن مضبوطی سے اٹھا کر کھڑا کیا اور چند قدم پرے کر دیا۔ ایک فوجی نے رائفل سے باپ کو بھی ایک طرف ہٹا کر ماں کے پاس لا کھڑا کیا۔

پھر کیپٹن ٹانگیں چیر کر تابوت پر کھڑا ہو گیا اور نوجوان کے دل میں اتنی پھرتی اور مہارت سے گولی ماردی کہ یوں لگا جیسے نالی نے ابھی نوجوان کے سینے کو چھوا بھی نہ تھا اور ماں باپ یہ سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہو کیا رہا ہے کہ قصہ ہی تمام ہو گیا۔

یہ بھی محسوس ہوا کہ خود نوجوان کو بھی اس بات کا ہوش صرف اس وقت آیا جب گولی اس کے دل میں اتر گئی۔ اس نے زور سے چیخ ماری، اس کا بدن کمان کی طرح تن گیا، اس نے اپنا سر اور ہاتھ پیر عجیب انداز میں لکڑی کے تختوں پر پٹخے اور پھر خالی بورے کی طرح پیچھے جا گرا۔

میجر نے چڑ چڑے انداز میں کہا، ''اب اسے لے جاؤ!'' اور ساتھ ہی حلیمی سے اضافہ کیا۔ ''ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں اور ادا کرتے رہیں گے۔''

والدین نے اس کی بات نہیں سنی اور اپنے بیٹے کے غم میں چیخیں مار مار کر رونے اور سسکیاں بھرنے لگے۔ فوجیوں نے زبردستی، مگر سختی سے کام لیے بغیر، انھیں تابوت سے دور رکھا۔ انھوں نے تابوت کو احتیاط سے دوبارہ ریہڑے پر لاد دیا اور اسے باندھنا نہیں بھولے۔ ڈھکنا انھوں نے تابوت پر رکھ دیا۔ ان کے پاس اب اوزار تو تھے نہیں اور کشتی کو جلد از جلد دوبارہ روانہ ہونا تھا کیوں کہ سڑک پر فوجی ٹرکوں کی قطار منتظر کھڑی تھی۔

جوں ہی فوجیوں نے کام پورا کیا، گھوڑے خود بخود چل پڑے۔ ماں باپ ریہڑے کے پیچھے ہو لیے۔ اور دبلا پتلا کسان دل ہی دل میں حیران ہوتا رہا: مجھے اس بات کا علم کیسے ہو سکتا تھا؟

تابوت کے پیندے کے کسی تختے سے غالباً کوئی گانٹھ نکل گئی تھی کیوں کہ خون، سیاہ اور خاموش، بہہ کر باہر آ رہا تھا۔ ماں، تابوت پر ہاتھ رکھ کر، ناقابلِ فہم لفظوں میں ماتم کرتی رہی اور باپ، روتا دھوتا

ہوا، گھوڑوں کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ وہ انھیں ہانکنا بھول چکا تھا۔

لفٹنٹ نے کہا، ''عجب مسخرے ہیں یہ کسان۔ اس وقت بھی اسی طرح رودھو رہے ہیں جیسے پہلے رودھو رہے تھے۔''

لیکن اس کی بات بھی کسی نے نہیں سنی۔ وہ سب ٹریفک کی نگہداشت میں کہیں زیادہ مصروف ہو چکے تھے۔



گریس اوگوٹ

جگر خوار

سوڈان کے نیم صحرائی علاقے میں چُھٹ برسات کا آغاز ہوا ہی تھا۔ اوّل وقت کی کہرا ابھی چھٹی تھی اور گرم دھوپ پڑنے سے گیلی زمین سے ہلکی نیلگوں بھاپ اٹھ رہی تھی۔

''پاتال والوں کے ہاں ہنڈیا چڑھ گئی
پاتال والوں کے ہاں ہنڈیا چڑھ گئی''

بچے ایک دوسرے کو گیلی ریت کے ڈلے مارتے ہوئے چلا رہے تھے۔

''چل بھئی، اوپی جا'' تیکا یو نے پکار کر اپنے لڑکے سے کہا۔ ''میرا ہاتھ بٹا۔ دھوپ بہت تیز ہونے سے پہلے پہلے مجھے گائیں دریا تک لے جانی ہیں۔''

اوپی جاتے جاتے اپنے چھوٹے بھائی پر آخری بار مٹھی بھر کر ریت پھینکا اور پھر دوڑ کر باپ کا ہاتھ بٹانے چلا گیا۔ گائیں جلد ہی گاؤں سے باہر پہنچ گئیں اور تیکا یو نے ادھوڑی کی تھیلی اٹھائی جس میں اس کا کھانا تھا، اور گایوں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ابھی وہ گھر سے زیادہ دور نہ گیا تھا کہ تیکا یو کو سر پر ایک عقاب نظر آیا جو پنجوں میں گوشت کا بڑا سا مچادا بے اڑا جا رہا تھا۔ عقاب نیچا ہو کر اڑ رہا تھا کیوں کہ وہ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر سکے۔ تیکا یو نے فوراً چھڑی پھینک کر ماری۔ چھڑی گوشت کو لگی اور وہ نیچے گر گیا۔ وہ کلیجی کا خاصا بڑا حصہ تھا اور تازہ لہو ابھی اس میں سے رس رہا تھا۔ تیکا یو کلیجی کو پھینکنے ہی لگا تھا کہ اس نے ارادہ بدل دیا۔ اگر کلیجی بس پھینکنی ہی تھی تو عقاب سے اس کا نوالہ چھیننے کی کیا تک تھی؟ کلیجی دیکھنے میں اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ترکاری لے کر آیا تھا۔ کلیجی کے اضافے سے کھانے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ اس نے کلیجی ایک پتے میں لپیٹ کر تھیلی میں ڈال لی۔

وہ ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں بہتیری گھاس تھی۔ تیکا یو نے گایوں کو چرنے چھوڑ دیا اور خود اوبیر

کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ابھی دو پہر کے کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا مگر تیکا یو سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ کلیجی کو چکھنے کی خواہش اس کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے کلیجی نکالی اور ادبیر کے تلے لکڑوں کی آگ جلا کر بھونی۔ جب کلیجی بھن گئی تو وہ اسے ندیدوں کی طرح جوار کی روٹی سے کھا گیا جو اس کی بیوی نے رات پکائی تھی۔

''واہ جی واہ! کیا لذیذ گوشت ہے،'' تیکا یو نے بے اختیار کہا۔ انگلیوں پر لگی گاڑھی چکنائی کو چاٹتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ کاش تھوڑی سی کلیجی کھانے کو اور مل جاتی۔ اس نے باقی ماندہ کھانا، جو کڑوی کسیلی جڑی بوٹیوں پر مشتمل تھا، اٹھا کر پھینک دیا۔ کلیجی اتنی ذائقہ دار تھی کہ جڑی بوٹیاں کھانے سے سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔

دھوپ بہت تیز ہو چلی تھی مگر گائیں دریا کنارے جا کر پیاس بجھانے کی طرف مائل نظر نہ آتی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے ادھر ادھر چھاؤں میں لیٹ کر جگالی کرنے لگیں۔ تیکا یو پر بھی سہ پہر کی تمازت غالب آ گئی۔ وہ پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر سو گیا۔

سوتے میں تیکا یو نے خواب دیکھا کہ وہ لکڑوں کی آگ جلائے کلیجی کا ویسا ہی بڑا سا ٹکڑا جیسا تھوڑی دیر پہلے کھایا تھا، بیٹھا بھون رہا ہے۔ بھنتے بوٹے میں سے گدّر چربی ٹپ ٹپ آگ میں گرتی دیکھ کر اس کے منھ میں پانی آ گیا۔ اس سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے کلیجی کے پوری طرح بھننے کا انتظار بھی نہ کیا، اسے پہلے ہی آگ پر سے اتار لیا۔ شکاری چاقو سے کلیجی کے ٹکڑے کیے۔ لیکن ابھی وہ پہلا لقمہ منھ میں رکھنے ہی والا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔

تیکا یو نے حیران ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کلیجی آخر گئی کہاں؟ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ ''نہیں نہیں!'' اس نے زور سے کہا۔ ''خواب اتنا صاف اور روشن کب ہوتا ہے۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ایک بار پھر اس امید پر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ شاید کراماتی طور پر کہیں آس پاس لکڑوں کی آگ پر کلیجی کا ٹکڑا بھنتا نظر آ جائے، لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اسے بس سال خوردہ درخت کی بڑی بڑی جڑیں دکھائی دیں جو زمین سے اس طرح ابھری ہوئی تھیں جیسے روسلی مٹی میں شکر قندیاں دبی ہوں۔

گائیں بھٹک بھٹکا کر بہت دور نکل گئی تھیں۔ تیکا یو اٹھا اور ان کے پیچھے چل پڑا۔ چلتے چلتے دریا کا کنارہ آ گیا اور پیاس کی ماری گائیں دریا کی طرف دوڑیں۔ جتنی دیر گائیں پانی پیتی رہیں تیکا یو ایک سفید پتھر پر بیٹھا پاؤں ٹھنڈے کرتا رہا اور الکسائے ہوئے انداز میں لبالب بہتے دریا کو دیکھا کیا جو زور شور سے میدان کی طرف رواں دواں تھا۔

دریا کے پرے بڑا بھاری ''بھوت بن'' واقع تھا۔ پُر نعمت گوشت کھانے کی شدید آرزو تیکا یو پر دوبارہ غالب آ گئی اور اس نے دبی آواز میں کہا، ''جس جانور کی مزے دار کلیجی میں نے کھائی تھی وہ ضرور اسی

جنگل میں ہوگا۔" وہ کچھ دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ اس جانور کا شکار کھیلنے کی ہوس اسے ستا رہی تھی، لیکن اس نے اپنے ہو کے پر قابو پا ہی لیا۔ سہ پہر خاصی ڈھل چکی تھی اور وہ گھر سے بہت دور تھا۔

اگلی صبح تیکا یو معمول کے وقت سے پہلے ہی گھر سے نکل پڑا۔ بیوی نے منت کی کہ دوپہر کا کھانا تیار ہونے کا انتظار تو کرلو، مگر اس نے ایک نہ سنی۔ شکار کھیلنے کے برچھے اٹھائے اور لپکا چلا گیا۔

تیکا یو نے گایوں کے لیے گھاس چرنا ناممکن بنا دیا۔ وہ انھیں دوڑاتا ہوا لے چلا اور اگر کوئی گائے کسی جگہ ذرا ٹھٹک جاتی تو اسے مارنے لگتا۔ وہ گلّے سمیت بھوت بن کے کنارے جا پہنچا اور وہاں گایوں کو اکیلا چھوڑ دیا کہ جہاں جی چاہے چرتی پھریں۔

اسے کوئی لیک یا ڈگر بھوت بن میں جاتی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ سارے کا سارا صبح سویرے کی اوس میں تربتر گھنی جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کا انبار تھا اور محو اختلاط پرندوں کی آوازوں کے سوا جنگل پر عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا جس سے تیکا یو پر ہول طاری ہوگیا لیکن اس کے جی میں جو زور آور خواہش بسی ہوئی تھی وہ اسے گھنی گیلی گھاس میں اندھا دھند ہانکتی گئی۔

کچھ دیر تک چلنے کے بعد وہ رکا اور کان لگا کر سننے لگا۔ کوئی چیز اس کی طرف دوڑی آرہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو واقعی ایک بڑا سا امپالا (۱) بے تحاشا اس کی طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ تیکا یو کے بدن میں گرم لہو تیزی سے گردش کرنے لگا اور اس نے جانور کو مارنے کے لیے برچھا تان لیا، لیکن برچھا پھینکنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک بڑی تیندوی جو امپالے کا پیچھا کر رہی تھی، اس کے عین سامنے آگئی۔ تیندوی تیکا یو پر کئی مرتبہ گرجی جیسے اسے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے للکار رہی ہو لیکن تیکا یو نے آنکھ چرالی۔ برچھا کانپتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑا کا پکڑا رہ گیا۔ لڑنے کو وہاں کوئی تھا ہی نہیں اور تیندوی اپنے شکار کے پیچھے چلی گئی۔

"کیسی خراب شروعات ہوئی،" تیکا یو نے دل کی دھڑکن معمول پر آجانے کے بعد ٹھیر ٹھیر کر دبی آواز میں کہا۔ "یہ جنگلی بلی اب میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

اپنی بنائی ہوئی لیک پر اُلٹے پاؤں میدان کی طرف پھر گیا۔ تیندوی کو دیکھ کر اس کا دم ہوا ہوگیا تھا۔

اسے ایک اور ڈگر دکھائی دی جو جنگل کے اندر جا رہی تھی۔ وہ ذرا سا ہچکچایا اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی لیک چھوڑ کر نئی ڈگر پر چلا جائے۔ راستہ چوڑا ہونا شروع ہوا اور چوڑا ہوتا چلا گیا، اور پھر اس سے پہلے کہ تیکا یو کو کوئی سن گن ملتی ولڈے بیسٹ (۲) کا ایک بچھورا اچانک سامنے آگیا جو ایک پہاڑ کے دامن میں چرنے والی بڑی ڈار کے پیچھے جا رہا تھا۔ تیکا یو نے بغیر کسی دقت کے اسے مار ڈالا۔ اس نے بچھورے

---

(۱) بڑے جثے کا بھورا افریقی ہرن۔

(۲) بڑے جثے کا بلدار سینگوں والا افریقی ہرن۔

کی کھال اتاری، کلیجی نکال لی اور سر دھڑ وہیں پڑا رہنے دیا۔

وہ اپنے گلّے کے پاس لوٹ آیا اور لکڑوں کی آگ جلا کر کلیجی بھوننے بیٹھ گیا۔ جب کلیجی بھن گئی تو اس نے چٹکٹ ماری اور جلدی جلدی چبانے لگا۔ لیکن لقمہ اس کے حلق سے نہ اترا۔ اس نے جتنا چبایا تھا سارے کا سارا تھوک دیا۔ کلیجی ان انتہائی چرپری ہری بوٹیوں جتنی بکسیلی تھی جو قبض میں مبتلا بچوں کو دی جاتی ہے۔ تیکایو کو ایسے لگا جیسے اس کی جیبھ کا پچھلا حصہ جل گیا ہو۔ اس نے باقی کلیجی پھینک دی اور گایوں کو لے کر گھر چلا گیا۔

تھکا ہارا اور مایوس وہ گھر پہنچا؛ اور جب جوان بیوی نے کھانا لا کے آگے رکھا تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ پیٹ میں درد ہے اور کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ اس رات تیکایو بہت پژمردہ تھا۔ اس کی طبیعت جوان بیوی کی طرف بھی راغب نہ ہوئی جو ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ صبح کو جوان بیوی دل شکستہ ہو کر اپنے جھونپڑے کو لوٹ گئی۔ وہ حیران تھی کہ اس کا مرد اس کی طرف ملتفت کیوں نہیں ہوا۔

جب تیکایو نے اپنے دروازے سے جھانکا تو باقی سب جھونپڑوں کے دروازے ابھی بند پڑے تھے۔ ٹھنڈی پروا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا اور وہ جلدی سے دوبارہ دروازہ بھیڑ کر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر ہو چلی تھی اور بچھڑے ڈکرا رہے تھے، لیکن بارش اتنی موسلا دھار تھی کہ تیکایو دودھ دوہنا شروع نہ کر سکا تھا۔ وہ اپنے سخت بستر پر بیٹھا الاؤ کی ٹھنڈی راکھ کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھر سے شکار کھیلنے نکل جائے۔

بارش تھمی تو تیکایو نے جلدی جلدی گایوں کو دوہا۔ جھونپڑے کے پاس دوپہر کا کھانا لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے کھانا اٹھایا اور گاؤں سے نکل گیا۔ جس بیوی کا رات اس نے دل توڑا تھا وہ اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ گاؤں کے بڑے دروازے سے گزر کر اوجھل ہو گیا۔

وہ بھوت بن پہنچا تو بوندا باندی دوبارہ شروع ہو گئی۔ جنگل بے حد اجاڑ اور سیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے حسبِ معمول گایوں کو چرنے چھوڑا اور جھاڑ بن میں قدم رکھا۔ وہ ٹپ ٹپ کرتے پتوں میں دبے پاؤں چلتا گیا۔ جنگل کے زیادہ گنجان حصے سے دور رہنے کے لیے بائیں طرف مڑا۔ قسمت یاور تھی۔ اسے ہرنوں کا ایک گلہ چرتا ہوا نظر آیا۔ ہرن اس سے زیادہ دور نہیں تھے۔ تیکایو گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا یہاں تک کہ ان کے بالکل پاس جا پہنچا۔ پھر اس نے برچھا پھینک کر مارا اور ایک جانور کو فی الفور ہلاک کر دیا۔ کھال کھینچنے کے بعد اس نے کلیجی نکال لی اور گوشت کے چند عمدہ پارچے گھر والوں کے لیے کاٹ کر الگ کر لیے۔

جب وہ پیڑ کے نیچے کلیجی بھوننے بیٹھا تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے لیکن جب اس

نے کلیجی چکھی تو سر ہلا کر رہ گیا۔ گوشت خستہ تھا لیکن اس میں وہ خاصیت نہیں تھی جس کی اسے تلاش تھی۔

وہ دریا کے کنارے جا پہنچا۔ پانی پینے کے بعد گایوں نے چرنے کا شغل جاری رکھا اور تیکایو، جو ابھی تک یہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اس عجوبہ کلیجی والے جانور کو ڈھونڈ کر رہے گا، گھومتا گھامتا کہیں سے کہیں نکل گیا اور اسے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ گلّہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اچانک اس نے گھوم کر دیکھا تو دور دور تک گلے کا پتا نہ تھا۔ سورج کوہ پاجولو کے عقب میں ڈوب رہا تھا اور تیکایو اپنی گایوں کو تلاش کرنے کے لیے دوڑنے دھوپنے لگا۔

گائیں، جن کے تھنوں سے دودھ ٹپکا پڑ رہا تھا، تیکایو کے بغیر ہی گھر کی طرف روانہ ہوگئی تھیں کیوں کہ ایک دن تیکایو کے بچے جنگل میں رستہ بھول گئے تھے اور گائیں اسی پرانی پگڈنڈی پر چلتی ہوئی جو ان کی جانی پہچانی تھی، ان کے بغیر ہی گھر پہنچ گئی تھیں۔ اس دن پورا گاؤں بچوں کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ گاؤں والوں کو ڈر تھا کہ جنگلی جانوروں سے بچوں کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

جب تیکایو گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ انھوں نے دودھ دوہنا شروع کیا اور ووی پو کہنے لگا، ''ارے بابا، آج تو تمھیں گھر آتے آتے دیر ہوگئی۔''

''سچ کہتے ہو،'' تیکایو نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ کالا بیل دیکھ رہے ہو ادھر؟ یہ دریا پار کر کے ایک اور گلے میں جا ملا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ غائب ہے۔ پلٹ چلنے کے سمے خیال آیا۔ اب کسی دن اسے خصی کرنا پڑے گا۔ اس نے بڑا دق کیا ہے۔''

وہ چپ چاپ دودھ دوہتے رہے۔ یہاں تک کہ گھرانے کی ایک لڑکی تھوڑا سا دودھ لینے آگئی، جو ترکاری کے سالن میں ڈالنے کے لیے درکار تھا۔

کھانے کا وقت ہوا تو خاندان کے سب مرد لکڑوں کی آگ کے گرد بیٹھ کر انتظار کرنے اور بتیانے لگے۔ مختلف جھونپڑوں سے ایک ایک کر کے باجرے کی روٹیوں کی چنگیریں اور مٹی کی رکابیوں میں گوشت اور ترکاری کے سالن آنے شروع ہوگئے۔ مچھلی تھی، سکھایا ہوا گوشت تھا، تلی ہوئی دیمک اور جڑی بوٹیاں تھیں۔ تھوڑا سا سالن آبا و اجداد کی خاطر زمین پر ڈال دیا گیا اور اس کے بعد وہ کھانے میں مشغول ہوگئے۔ جو سالن ان کے سامنے تھے ان کی لذت کا موازنہ کرنے اور فرق بتانے لگے۔ لیکن تیکایو چپ رہا۔ اس رات جو چیز بھی اس نے کھائی وہ اسے پت کی طرح کڑوی معلوم ہوئی۔

کھانا ختم ہوا تو بڑے، چھوٹوں کو جنگوں اور قبیلوں کی کہانیاں سنانے لگے۔ بچے غور سے سنتے رہے۔ لیکن تیکایو اپنے آپ میں گم تھا۔ وہ ان کی باتیں سن نہیں رہا تھا۔ دھواں دھار بادلوں کو دیکھتا رہا جو آسمان پر اڑے جا رہے تھے۔

''ان بادلوں کے پچھواڑے، ان بادلوں کے پچھواڑے، میرے پر دادا اوکین یو، بسرام کر رہے ہیں۔'' دیا کرو! دیا کرو!'' تیکا یو نے گڑگڑا کر کہا۔ ''اے باپ، دیا کرو، مجھے اس ہوکے سے چھٹکارا دلا دو، مجھے میری مردی لوٹا دو تا کہ میں اپنی بیوی کی طرف راغب ہوسکوں۔ کیوں کہ وہ مرد ہی کیا جو اس رغبت سے محروم ہو۔''

ایک بڑے بادل نے چاند کو ڈھک لیا جس سے دنیا میں وقتی طور پر اندھیرا چھا گیا۔ آنسوؤں کی وجہ سے تیکا یو کی آنکھوں میں جلن ہوئی اور اس نے اہل خاندان سے کہا کہ جا کر سو جائیں۔ جب اس نے اپنے جھونپڑے میں قدم رکھا تو ایک عورت چھوٹے چھوٹے کندے الاؤ میں ڈال رہی تھی۔

اس نے رفتگاں کی ارواح سے بار بار چوری چھپے دعا مانگی لیکن پر اسرار کلیجی کھانے کی تمنا کبھی اس کے جی سے فرو نہ ہوسکی۔ روزانہ صبح سویرے وہ اپنی گایوں کو ساتھ لے کر گھر سے نکل جاتا اور جنگل کے پاس پہنچ کر انھیں اکیلا چھوڑ دیتا اور جا کے شکار کھیلنے لگتا۔ جو پُر صعوبت اور یاس انگیز زندگی تیکا یو گزار رہا تھا وہ جلد ہی اس کے اہل خانہ پر واضح ہوگئی۔ وہ یکا یک بوڑھا ہوگیا۔ اسے زندگی سے دلچسپی نہ رہی۔ رات کے وقت جب وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھتا تو اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ اسے اپنی بیویوں کی طلب نہ رہی۔ تیکا یو کے بیٹے لا کیچ کے پاس گئے اور کہنے لگے، ''اماں، ابا سے بات تو کرو۔ وہ بیمار ہیں۔ نہ ہم سے بولتے چالتے ہیں نہ کچھ کھاتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی توجہ کیسے حاصل کی جائے۔''

اگرچہ لا کیچ عمر کے اس حصے میں تھی جب عورت بچہ جننے کے قابل نہیں رہتی اور اس نے رات کو تیکا یو کے جھونپڑے میں جانا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ اس کی پہلی بیوی تھی اور تیکا یو کو اس سے محبت تھی۔ لہٰذا وہ اس کے پاس گئی اور پوچھنے لگی، ''اے میاں، تجھے کیا تکلیف ہے؟'' تیکا یو نے لا کیچ کی طرف دیکھا مگر اس سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔ اس نے لا کیچ کی صراحی دار گردن پر نظر ڈالی اور اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھنے لگا، ''تو پیتل کے ان وزنی کڑوں سے چھٹکارا پانا پسند کرے گی جو تیری گردن میں پڑے ہیں؟''

''کیوں؟'' لا کیچ نے قدرے متعجب ہو کر کہا۔

''کیوں کہ یہ اتنے تنگ معلوم ہوتے ہیں۔''

''لیکن یہ تنگ تو نہیں ہیں،'' لا کیچ آہستہ سے بولی۔'' ان کے بغیر مجھے یوں لگے گا جیسے ننگی ہوگئی ہوں۔''

اور تیکا یو اپنی بیوی سے نظر ہٹا کر اور طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لا کیچ کو سب کچھ بتا

دے اور اس پاگل بنا دینے والی خواہش کا بھید کھول دے جو اس کے تن بدن کے پرزے اڑا رہی تھی، لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ ''لاکیچ کو ہرگز خبر نہ ہونی چاہیے۔ وہ بات کو سمجھ نہ پائے گی۔'' پھر اس نے لاکیچ سے جھوٹ بولا۔

''مجھے پرانا عارضہ ہے بدہضمی کا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے تکلیف میں مبتلا ہوں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

لاکیچ کے ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ کھیلنے لگی اور تیکایو سمجھ گیا کہ وہ قائل نہیں ہوئی۔ اتنے میں چند ملاقاتی آ گئے اور لاکیچ شوہر کے پاس سے اٹھ گئی۔

تیکایو مہینوں شکار کھیلتا رہا لیکن اس جانور کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کی مزیدار کلیجی اس نے کھائی تھی۔

ایک رات جب اس کی آنکھ نہ لگی تھی، لیٹے لیٹے اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ وہ اور کہاں جا کر شکار کھیلے اور وہ جانور کون سا ہے جو اسے تلاش کرنا ہوگا؟ وہ بھوت بن میں تمام جانوروں کو مار چکا تھا۔ اس نے جان پر کھیل کر شیر ببر، تیندوے اور لکڑ بھگے کا شکار کیا تھا اور ان کی کلیجی کھائی تھی، اور یہ تینوں جانور اس کے قبیلے پر حرام تھے۔

تیکایو کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ نیند کی جھپکی آئی تو اس نے شکر کیا۔ لیکن تب آپٹی سرہانے آ کھڑی ہوئی اور پکارنے لگی، ''دادا جان، دادا جان، میں آئی ہوں۔'' تیکایو اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن چھوٹی بچی وہاں نہیں تھی۔ وہ دوبارہ سو گیا۔ اور آپٹی آ موجود ہوئی اور پکار کر بولی:

''آپ کو میری آواز سنائی نہیں دے رہی، دادا جان؟''

تیکایو دوبارہ جاگ گیا لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بغیر لیٹا رہا۔ بچی کی انگلیاں پھر سے بوڑھے کے جسم کو گدگدانے لگیں۔ تیکایو تیسری بار اٹھا اور کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن وہ اکیلا تھا۔ مرغ نے تیسری بار اذان دی اور صبح ہو گئی۔

اور لاکیچ اپنے شوہر کے راز سے آشنا ہوئے بغیر ہی فوت ہو گئی اور پہلی بیوی ہونے کے ناتے اسے گاؤں کے بالکل بیچ میں دفن کیا گیا۔ تیکایو ایک مدت تک صبح شام اپنی بیوی کی قبر پر بیٹھا رہا اور لاکیچ کے غم کے مارے نامعلوم جانور کی کلیجی کی جو بھوک اسے لگی رہتی تھی وہ جاتی رہی۔ وہ روتا رہا مگر اس طرح جیسے اسے چین آ گیا ہو، جیسے کلیجی کھانے کی طلب بیوی کے ساتھ ہی دفن ہو چکی ہو۔

سوگ کے انھیں دنوں میں تیکایو نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ شکار کھیلنے نہ جائے گا۔ وہ گھر بیٹھے اپنے ڈھیر سارے پوتے پوتیوں پر نظر رکھتا اور خاندان کے نوجوان افراد روز باہر جا کر کھیتوں میں کام کاج کرتے۔

اور پھر ایک دن تیکایو صبح صبح کھلیان کے پاس بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اندھیرے کھلیان میں جمع اناج میں جو انکھوے پھوٹ رہے تھے ان کی باس سے اس کی طبیعت ذرا مالش کرنے لگی۔ اپنے پوتے پوتیوں کو شور وغل مچاتے اور گیت گاتے سنا تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ انھیں کھیلتے ہوئے دیکھ کر اس نے حیران ہو کر سوچا، کیا دنیا کا کوئی جاندار ایسا بھی ہے جس کی کلیجی اس نے نہ چکھی ہو؟ وہی پرانی خواہش اس طرح عود کر آئی کہ اس کا بدن اندر سے دکھنے لگا۔

ان بچوں میں جو وہاں کھیل رہے تھے، آپٹی نام کی ایک چھوٹی سی خوبصورت بچی بھی تھی۔ وہ تیکایو کے سب سے بڑے لڑکے کی بیٹی تھی۔ تیکایو نے بچوں سے کہا کہ وہ کہیں اور جا کر کھیلیں اور جب وہ وہاں سے جانے لگے تو اس نے آپٹی کو آواز دی اور کہا، ''چلو، میری ننھی بٹیا، دوڑ کے اپنی امی کے جھونپڑے میں جاؤ اور میرے لیے توبنے میں پانی لے آؤ۔''

آپٹی پانی لینے اپنی ماں کے جھونپڑے میں چلی گئی۔ جب وہ گھر کے ایک اندھیرے کونے میں ادھر ادھر ہاتھ مار رہی تھی تو اسے یہ علم نہ تھا کہ تیکایو دبے پاؤں بڑی تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے اندر گھس آیا ہے۔ اس نے اپنی گردن پر دو کھردرے ہاتھوں کی گرفت محسوس کی۔ بچی کا جسم ڈھیلا پڑ کے تیکایو کے ہاتھوں سے پھسل گیا اور دھم سے فرش پر جا گرا۔ اپنے قدموں میں پڑی لاش کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے اس کا جی متلا رہا ہو، جیسے وہ غش کھانے والا ہو۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اس نے لاش اٹھائی اور جب وہ اسے اٹھا کر لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا تو فضا تاریک معلوم ہو رہی تھی اور ہوا میں اڑنے والے پرندے نحوست بھرے انداز میں اس پر چلچلا رہے تھے، لیکن تیکایو کو تو اپنا پیٹ بھرنا تھا۔ اس نے قریب میں واقع ایک دیمک ٹیلے میں اتھلا سا گڑھا کھود کر آپٹی کو توپ دیا۔

جب تیکایو تھیلی میں کلیجی لے کر واپس آیا تو باقی بچے ابھی میدان میں کھیل رہے تھے۔ اس نے جھونپڑے میں بیٹھ کر کلیجی کو جھٹ پٹ بھونا اور ندیدوں کی طرح کھا لیا۔ اور افسوس! یہی وہ شے تھی جس کی اسے اتنے برسوں سے تلاش تھی۔ وہ الکسائے انداز میں کھلیان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ڈکارنے اور دانتوں میں خلال کرنے لگا۔ بھوکے بچے کھلے میدان سے کھیل کود کر پلٹے تو چھاؤں میں بیٹھ کر شکرقندیاں کھانے اور چھاچھ پینے میں مصروف ہو گئے۔

بڑی عمر کے لوگ شام پڑے واپس آئے تو بچے اپنے اپنے والدین سے ملنے دوڑے۔ لیکن آپٹی ان کے درمیان موجود نہ تھی۔ بہت بوکھلا کر انھوں نے دادا سے بچی کے بارے میں دریافت کیا لیکن تیکایو نے جواب دیا، ''بچوں سے پوچھو۔ انھیں پتا ہونا چاہیے کہ آپٹی کہاں گئی۔ یہ سب مل جل کر میدانوں میں کھیلتے پھر رہے تھے۔''

اس وقت تک اندھیرا گھپ ہو چکا تھا۔ آپٹی کے چھوٹے بہن بھائی الاؤ کے سامنے بیٹھ کر اپنی ماں کے ساتھ رونے دھونے لگے۔ تب انھیں یاد آیا کہ دادا نے آپٹی کو پانی لا کر دینے کے لیے بلایا تھا۔ بے اوسان والدین نے یہ اطلاع بڑے میاں کے سامنے دہرائی اور پوچھا کہ کیا آپٹی نے صبح اسے پانی لا کر دیا تھا۔

''دیا تھا،'' تیکایو بولا، ''اور پھر ادھر چلی گئی تھی جدھر باقی بچے گئے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا۔ جب بچے واپس آئے تو میں سو رہا تھا۔''

غم سے نڈھال گھر والے سر پکڑ کر الاؤ کے پاس بیٹھ گئے۔ نہ انھوں نے کچھ کھایا نہ پیا۔ باہر چھوٹے چھوٹے جھینگریوں بول رہے تھے جیسے کوئی غمگین کہانی سنا رہے ہوں۔ تیکایو کو لگا کہ وہ معمول سے زیادہ بلند آواز میں جھنکار رہے ہیں۔

آپٹی کے ماں باپ بہت دن تک بچی کو ڈھونڈتے رہے۔ انھوں نے چپا چپا چھان مارا لیکن اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ وہ غائب ہو گئی تھی۔ مہینے گذر گئے اور لوگوں نے آپٹی کی گمشدگی کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔ صرف ماں کو آپٹی یاد آتی رہتی تھی۔ وہ ابھی تک پر امید تھی کہ ایک نہ ایک دن بچی اسے زندہ سلامت مل جائے گی۔

تیکایو کو یاد بھی نہ رہا کہ اس سے کیا حرکت سرزد ہوئی تھی اور اس نے اپنی وحشیانہ اشتہا کی تسکین کے لیے ایک اور بچے کی جان لی تو اسے احساس تک نہ ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ جب پریشان والدین نے بچے کے بارے میں تیکایو سے پوچھا تو وہ رو کر کہنے لگا، ''مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟ بچے تو ادھر باہر میدانوں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ میں گھر بیٹھا رہتا ہوں۔''

اس سانحے کے بعد تیکایو کے بیٹوں نے آپس میں بات کی۔ ''ہمارے بچے کون چرا کر لے جا رہا ہے؟ یہ کون سے جانور کا کام ہے؟ کیا یہ لکڑ بھگے کی حرکت ہے؟ یا تیندوے کی؟ لیکن یہ جانور تو صرف رات کو شکار کرنے نکلتے ہیں۔ کہیں یہ کسی عقاب کی کارستانی تو نہیں کیوں کہ وہ دن کے وقت شکار پکڑتا ہے؟ لیکن نہیں! عقاب ہوتا تو ابا کو نظر آ جاتا۔ وہ بچوں کی چیخوں کی آواز سن لیتے۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد آگندا نے اپنے بھائیوں سے کہا، ''شاید یہ کوئی موذی جانور ہے جسے بدروحوں نے ہم پر مسلط کیا ہے۔''

''پھر تو میرے ابا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں کہ بچوں کی نگہبانی نہیں کر سکتے،'' اوسوگو بول اٹھا۔

''ہاں، ابا بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ ان کی جان بھی خطرے میں ہے۔'' باقیوں نے اتفاق کیا۔

اور اس وقت کے بعد سے بیٹے پوشیدہ طور پر اپنے باپ اور بچوں پر نظر رکھنے لگے۔ وہ کئی مہینے تک نگرانی کرتے رہے لیکن بڑے میاں اور بچوں پر کوئی آفت نہ آئی۔

بیٹے اس چوکی پہرے کو تقریباً ترک ہی کرنے والے تھے لیکن ایک روز پہرہ دینے کی باری آپٹی

کے باپ کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ تیکایو نے بچوں سے کہا کہ وہ جا کر دور کہیں کھلے میدان میں کھیلیں مگر ایک بچے کو روک لیا۔ تیکایو نے بچے سے کہا کہ جا کر اس کے جھونپڑے سے پائپ اٹھالائے۔ جب بچہ دوڑا دوڑا جھونپڑے کی طرف گیا تو تیکایو اس کے پیچھے ہولیا۔ اس نے خوفزدہ بچے کو جا دبوچا اور اس طرف گھسیٹنے لگا جہاں الاؤ روشن کیا جاتا تھا۔ جب تیکایو بچے سے زور آزمائی کر رہا تھا تو اس کی بوڑھی کمر پر بڑے زور کا گھونسا پڑا۔ بچے کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے اسی طرح پکڑے پکڑے تیکایو نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا، آگندا، سامنے کھڑا تھا۔ تیکایو کے ڈھیلے پڑتے ہاتھوں سے بچے نے خود کو چھڑا لیا اور آگندا کے گھٹنے پکڑ لیے۔ ''ابا!'' آگندا نے چیخ کر کہا۔

یہ دیکھ کر کہ بچے کو کوئی گزند نہ پہنچی تھی، آگندا نے اسے پرے دھکیل دیا اور کہنے لگا، ''اپنی ماں کے جھونپڑے میں جا کر لیٹ جاؤ۔''

پھر اس نے بوڑھے کو پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا اس چھوٹے جھونپڑے کی طرف لے چلا جو بھیڑ بکریوں کے لیے مخصوص تھا اور جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ جب اسے گھسیٹ کر لے جایا گیا تو بوڑھا زور زور سے یہی رٹ لگائے رہا۔ ''اتیموٹگھو؟ اتیموانگھو؟'' (میرا کیا قصور ہے؟ میرا کیا قصور ہے؟)

آگندا نے بوڑھے کو چھوٹے جھونپڑے میں دھکیل کر باہر سے دروازہ اس طرح زنجیر کر دیا جیسے اندر کوئی جانور بند کیا گیا ہو۔ وہ بچے کے پاس چلا گیا جو اب تک سسکیاں بھر رہا تھا۔

خاندان کے باقی لوگ کھیتوں، میدانوں سے لوٹ کر آئے اور جب آگندا نے یہ خبر انھیں سنائی تو وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ اہل خاندان نے ماتمی لباس پہن لیا اور کھانا نہ کھایا۔

''تھو! تھو!'' انھوں نے سورج کی طرف منھ کر کے تھوکا جو اُن کے لیے غروب لیکن ان کے اجداد کے لیے طلوع ہونے والا تھا۔

''اے ہمارے پُرکھو، ہمیں پاک کر دو،'' ان سب نے پکار کر کہا۔

اور پھر انھوں نے بہت بڑا الاؤ جلایا۔ گاؤں میں اتنا بڑا الاؤ پہلے کبھی روشن نہ کیا گیا تھا۔ تیکایو کا سب سے بڑا بیٹا باپ کے جھونپڑے سے وہ پرانا، چربی سے چکنا ڈھول اٹھا لایا جو الاؤ کے اوپر ٹنگا رہتا تھا اور اسے بجانے لگا۔ دھم دھم بجتے ڈھول کی غم آلود دھنوں نے قبیلے کو خبردار کر دیا کہ تیکایو کے ہاں کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے۔ ڈھول بجتا سن کے لوگ اپنے سب کام کاج چھوڑ کر تیکایو کے گاؤں کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈھول کی آواز ان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں رشتے داروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے جن کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔

''کیا خبر ہے؟ کیا خبر ہے؟'' یہ پوچھتے ہوئے ان کی آوازیں کانپ رہی تھیں۔

''اور تیکا یو کہاں ہے؟'' ایک اور بوڑھے آدمی نے دریافت کیا۔
''اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' کسی اور نے پوچھا۔
وہاں ابتری اور سراسیمگی کا عالم تھا۔
''موت کی موت، موت کی دوا ہمیں کون لا کے دے گا؟ موت تمھارے دروازے پر دستک دیتی ہے اور تمھاری طرف سے اندر آنے کی اجازت ملنے سے پہلے ہی گھر میں آدھمکتی ہے۔''
''سنو،'' کسی نے اس بڑھیا کو چھو کر کہا جو موت کے بارے میں آہ وزاری کر رہی تھی۔ آگندا نے لوگوں سے خطاب کیا۔
''اے میرے قبیلے کے لوگو! ہم نے تمھیں یہاں خواہ مخواہ نہیں بلایا۔ جو میں کہتا ہوں سنو اور ہمارے غم میں شریک ہو۔ ہمارے ساتھ مل کر روؤ۔ کئی مہینے ایسا ہوتا رہا کہ ہم تو باہر جا کر کھیتوں میدانوں میں اپنا کام کاج کرتے اور ادھر ہماری عدم موجودگی میں ہمارے بچے غائب ہو جاتے۔ سب سے پہلے میری اپنی بچی آپٹی گم ہوئی۔'' بچوں کے نام سن کر عورتوں کے درمیان سے سسکیوں کی آواز آنے لگی۔
''اے میرے لوگو!'' آگندا نے بات جاری رکھی۔ ''اس قبیلے کے بچے بیمار ہو کر مرتے ہیں۔ لیکن ہمارے بچے ایسے غائب ہوئے کہ ان کو دفنانے کی نوبت تک نہ آئی۔ ہم نے سوچا کہ بچوں پر پہرہ دیا جائے تاکہ جو کوئی بھی ہمارے بچے اٹھا کر لے جاتا ہے اسے پکڑا جا سکے۔ کئی مہینے ہم چوری چھپے پہرہ دیتے رہے۔ ہم اس نگرانی کو تقریباً ختم ہی کرنے والے تھے، کیوں کہ ہمارا خیال تھا کہ غالباً ہم پر ہمارے اجداد کی طرف سے عذاب نازل ہوا ہے، لیکن آج میں نے اسے پکڑ لیا۔''
''کون ہے وہ؟ کون ہے وہ؟'' لوگوں نے غصے میں آ کر معلوم کرنا چاہا۔
''اور اس کا کس قبیلے سے تعلق ہے؟'' دوسروں نے پوچھا۔
''ہمیں لازمی طور پر اس قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کر دینا چاہیے۔ یہ ہم پر فرض ہو گیا۔ فرض ہو گیا۔''

آگندا ذرا کے ذرا رکا اور پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں انھیں بتایا، ''وہ آدمی اس چھوٹے جھونپڑے میں ہے۔ اور کوئی اور نہیں، میرا ہی باپ ہے۔''
''ہائے ہائے!'' عورتیں چیخ اٹھیں۔ دھکم پیل ہوئی۔ اور عورتیں اور بچے اس طرح چیخے جیسے تیکا یو ان کے آس پاس موجود ہو اور انھیں اس سے ڈر لگ رہا ہو۔ لیکن مرد خاموش رہے۔
جب افراتفری ختم ہوئی تو ایک بوڑھے نے پوچھا، ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو، میاں؟''
بیٹے نے سر ہلایا۔ اب مرد عورت چلا چلا کر کہنے لگے، ''کہاں ہے وہ آدمی؟ مار ڈالو، اسے مار ڈالو۔

وہ ہم میں سے نہیں ہے، وہ جانور ہے۔''

باہر کہی جانے والی کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو تیکا یو کو سنائی نہ دی ہو اور جھونپڑے میں وہ بچے جن کا اس نے خون کیا تھا، اس کے اوسان پر سوار تھے۔ وہ جھونپڑے کی کھردری دیوار پر سر ٹکا کر لیٹ گیا اور رو پڑا۔

جھونپڑے کے باہر گاؤں والوں نے، جنھیں غصہ چڑھا ہوا تھا، اپنا مطالبہ جاری رکھا۔ وہ چیخ رہے تھے، ''اسی وقت سنگسار کردو اسے۔ اسی وقت سنگسار کردو اسے۔ اس نے خود اپنی ہلاکت کا سامان کیا ہے۔''

لیکن بڑے بوڑھوں میں سے ایک آدمی اٹھا اور اس نے لوگوں کا جوش ٹھنڈا کیا۔ ''ہم اسے اس وقت سنگسار نہیں کر سکتے۔ قبیلے کا دستور ہے کہ جو آدمی موذی بدذات ہو اسے دن دہاڑے گاؤں کے باہر سنگسار کیا جائے۔ ہم اس دستور سے روگردانی نہیں کر سکتے۔''

''مجھے اسی وقت سنگسار کردو، مجھے اسی وقت سنگسار کردو،'' تیکا یو نے سرگوشی کی۔ ''مجھے جلدی سے اس عذاب اور شرمساری سے نجات دلاؤ۔ مجھے مر جانے دو تاکہ میرا اٹنتا ختم ہو۔''

مردوں کی غصیلی ہوہا اور خوفزدہ عورتوں اور بچوں کی مہین چیخیں سن کر تیکا یو سمجھ گیا کہ معاشرہ اسے دھتکار چکا ہے۔ یہی نہیں، اس کا زندہ رہنے کا حق بھی چھن چکا ہے۔ اس نے اپنا شکاری چاقو تلاش کرنے کے لیے کمر سے بندھی ادھوڑی کی تھیلی کو ٹٹولا لیکن چاقو تھیلی میں نہ تھا۔ چاقو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ باہر لوگ برابر شور کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ رونے دھونے کی آواز بھی آرہی تھی۔ تیکا یو اب یہ سب کچھ بہت فاصلے سے سن رہا تھا جیسے کوئی زور آور موج اسے اپنے لوگوں سے دور، بہت دور لیے جارہی ہو۔

صبح سویرے گاؤں والے الاؤ کے پاس سے اٹھے تاکہ آس پاس کے میدانوں میں جاکر پتھر اکٹھے کریں۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا لیکن روشنی اتنی ہوگئی تھی کہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ قبیلے کے ہر آدمی پر فرض تھا کہ وہ قاتل کو پتھر مارے۔ پتھر نہ مارنا خرابی کا باعث تھا کیوں کہ کہا یہ جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص قاتل کی خبیث روح کو پتھر مار کر دور دفان کرنے میں ہاتھ نہیں بٹائے گا تو روح اسی کو چمٹ جائے گی۔

جب سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں تو گاؤں والے اتنے پتھر اکٹھے کر چکے تھے کہ ان کے نیچے کئی جسم دب سکتے تھے۔ وہ گاؤں واپس آئے تاکہ تیکا یو کو جھونپڑے سے نکالیں اور گاؤں کے باہر خود اس کے باغ کی طرف لے چلیں۔ وہ جھونپڑے کے چاروں طرف جمع ہوکر خاموش کھڑے ہوگئے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ تیکا یو باہر آئے تو اس پر آوازے کسیں اور تھوکیں۔

آگندا اور تین دوسرے بوڑھوں نے نرسلوں کا بنا ہوا دروازہ دھڑاکے سے کھول دیا اور تیکا یو کو باہر نکلنے کو کہا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ وہ لپک کر جھونپڑے میں جا گھسے تاکہ اسے گھسیٹ کر لوگوں کے سامنے لے آئیں جو تقاضا کر رہے تھے، ''باہر نکل! باہر نکل!''

شروع میں تو اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہ آیا لیکن جلد ہی ان کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوگئیں۔ تب انھوں نے دیکھا کہ تیکایو کی لاش ایک چھوٹی سی رسی سے لٹکی ہوئی ہے جو اس نے چھپر میں سے کھول لی تھی۔

وہ چاروں سر ہلاتے ہوئے باہر آگئے۔ مجمع نے باری باری جھونپڑے میں جھانکا، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک نے تیکایو کا لٹکتا ہوا جسم دیکھ لیا، اس آدمی کو دیکھ لیا جسے سنگسار کرنے کی وہ تیاری کر رہے تھے۔ کوئی بولا تک نہیں۔ انھیں پتا تھا کہ ایسے شخص کو گاؤں کے باہر دفنانا پڑے گا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ آئندہ کبھی کسی نوزائیدہ بچے کا نام تیکایو نہیں رکھا جائے گا۔

نا ڈین گورڈیمر

دولھا

اُس سہ پہر اس نے آخری بار اپنے سر راہ ڈیرے میں قدم رکھا۔ صفائی ستھرائی کے لحاظ سے کوئی گھر کبھی اس ڈیرے کے پاسنگ کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اردگرد کی کھلی جگہ میں ریت ہموار کر کے بچھا ہوا، پانی کے ڈرم ترپال کے نیچے دھرے، گرمی سے بچاؤ کی خاطر خیمے کے پردے گرے ہوئے۔ تیس گز پرے ایک کالی عورت گھٹنوں کے بل جھکی، مکئی کوٹتی ہوئی اور دو تین بچے، کالاہاری کی دھول میں اٹ کر بھوسلے، ایک چرخ کتے کے ساتھ کھیلتے ہوئے۔ ان عظیم وسعتوں میں، جن کے درمیان یہ ڈیرا گم تھا، ان کی مہین آوازیں یوں لگتی تھیں جیسے کسی چڑیا کی چوں چوں۔

اس کے خیمے میں بیتی رات کی کچھ نہ کچھ ٹھر باقی رہتی تھی، باسی مگر ٹھنڈی، جیسے کسی گرجے کی فضا۔ وہاں اس کا لوہے کا پلنگ بچھا تھا جس پر صاف تکیہ غلاف تھا اور پوستین کا بنا بڑا سارا کمبل۔ وہیں اس کی میز تھی، تہہ ہو جانے والی کرسی تھی جس کی سیٹ سرخ کرمچ کی تھی اور وہ صندوق تھا جس میں اس کے کپڑے تھے۔ صندوق پر اس کی الارم والی گھڑی رکھی تھی جو روز صبح پانچ بجے اسے جگا دیتی تھی اور فرانس ٹاؤن میں رہنے والی اس سترہ سالہ لڑکی کی فوٹو بھی تھی جس سے وہ شادی کرنے والا تھا۔ لڑکی اور الارم گھڑی، وہ کافی دیر سے وہاں پہ تھیں، صبح سویرے بھی جب وہ آنکھیں کھولتا، سہ پہر کو بھی جب وہ کام پر سے لوٹتا۔ لیکن آج یہ آخری بار تھی۔ صبح اسے روڈ ڈپارٹمنٹ کے دس ٹن والے ٹرک میں فرانس ٹاؤن جانا تھا۔ اگلے ہفتے جب وہ واپس آئے گا تو شادی شدہ ہوگا اور لڑکی اس کے ساتھ ہوگی اور وہ ریل کے ڈبے جیسا خانۂ رواں بھی جو محکمے کی طرف سے شادی شدہ مردوں کو ملتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھتے اور بوٹ اتارتے وقت اس کی نظر لڑکی پر جمی ہوئی تھی؛ وہ مسکراتی لڑکی ان چہروں جیسا ایک چہرہ تھی جنھیں کسی رسالے سے کاٹ لیا گیا ہو۔ اس نے وہ کپڑے اتارنے شروع کیے جو کام کرتے وقت پہنے ہوتے تھے، خاکی رنگ کی ایک چھال، دھول سے اکڑی اکڑی، جو اتارے جانے کے بعد بھی اس کی کاٹھی کا انداز اپنائے رہی اور اس نے رسان اور دھیمے

پن سے آواز دی: ''پیٹ بابا، اب آ بھی چکو۔'' لیکن وہ کالا ہڈیلا مرد، جس کی بھنویں، کسی مسخرے کی بھنووں کی طرح، زور لگانے کی وجہ سے چڑھی ہوئی تھیں اور ننگے پاؤں بوجھ تلے گھسٹ رہے تھے، ٹین کا ٹب اٹھائے خیمے تک پہنچ بھی چکا تھا۔ تتے پانی کے کبھی ٹب کے اِس کنارے اور کبھی اُس کنارے سے ٹکرا کر چھلکنے سے جھنجھناتا ہوا سُر بلند ہو رہا تھا۔

نہانے دھونے اور خاکی رنگ کی صاف قمیص اور گھسی ہوئی بھوری پتلون پہننے اور خوشبودار پومیڈ چپڑ کر بال جمانے کے بعد وہ ٹھیک اس وقت خیمے سے باہر آیا جب افق کا پپوٹا سورج کی لہولہان آنکھ کو ڈھانپ چکا تھا۔ جاڑوں کے دن تھے اور سورج پانچ بجنے کے ذرا بعد ہی ڈوب جاتا تھا۔ خاکستری ریت دھندلاتے پیازی رنگ میں بدل گیا۔ نیچی کٹیلی جھاڑیوں سے بنفشئی سائے کے بڑے ہوتے دھبے پھوٹ پڑے جو سب کے سب تھوڑی دیر میں گھل مل گئے۔ اس کے بعد صحرا کی سطح، ایک دو منٹ کے لیے، ننھے ننھے گڑھوں سے بھری اور مسام دار نظر آئی، جیسے دوربین میں سے چاند کی سطح دکھائی دیتی ہے۔ اس دوران میں اندھیری ہوتی دنیا سے دور اوپر آسمان میں اجالا تھا اور شام کے تارے کی نرمل بلوری کنکری جگمگا رہی تھی۔ وہاں جو الاؤ روشن تھے — خود اس کے ڈیرے کا الاؤ، اوپر کی طرف کالوں کی جلائی ہوئی آگیں — وہ سیال رنگ کی تقریباً غیر مرئی ٹمٹماہٹ سے بدل کر نور کے اچھلتے زبانوں کی درخشاں آماج گاہیں بن گئے۔ اندھیرا چھا گیا۔ ہر شام وہ اسی طرح دن تمام ہونے کی مختصر ریت پوری ہونے تک بیٹھا آہستہ آہستہ اپنا پائپ بھرتا رہتا، آہستہ آہستہ اپنی پیٹھ کو، ڈھیلا چھوڑ کر، آگ کی طرف پھیر دیتا اور دن بھر کی محنت مشقت سے پیدا ہونے والی اکڑاہٹ کو جمائیاں لے لے کر دور کرتا۔ یکایک اس نے، اشتیاق کے مارے، آپ ہی آپ دبا دبا سا قہقہہ لگایا۔ لڑکی کا وجود اس کے لیے حقیقی بن گیا۔ اسے فوٹو والا چہرہ یوں دکھائی دیا جیسے وہ کسی خانۂ رواں کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چستی کے ساتھ، جو امید نے اس کے اندر پیدا کر دی تھی، ڈیرے کے آس پاس چہل قدمی کرنے لگا۔ اس نے لکڑی کے ایک کندے کو ٹھوکر مار کر آگ میں اَور اندر دھکیلا، پکار کر پیٹ کو حکم دیا، چلتا ہوا خیمے کی طرف گیا، پھر اپنا ارادہ بدل لیا اور ٹہلتا ہوا واپس چلا آیا۔ اس کے ڈیرے کے کنارے پر اپنے پڑاؤ میں سڑک بنانے والے مزدور ایک دوسرے کے جواب میں قہقہے لگانے، باتیں کرنے، چیخنے چلانے اور بحث کے اس معمول کا آغاز کر چکے تھے جو کام ختم ہونے کے بعد کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔ سفید صابن کے گھنے جھاگ کے نیچے سے کالی کالی بانہیں ہل جل کر اشارے کرتیں۔ جب بالٹی بھر پانی کا ٹھنڈا زور کسی کے سر سے ٹکرا کر بکھرتا تو زور سے سانس کھینچنے اور ہوکا بھرنے کی آواز آتی۔ کھانا پکانے کی تیاری کے دوران میں، باتوں کے تانتے کے ساتھ ساتھ، لوہے کی ہنڈیوں کے چمکتے ہوئے ڈھینڈے اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آتے۔ وہ جو گفتگو کر رہے تھے اس کا بیشتر حصہ

وہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ تسوانا بولی اسے بس اتنی ہی آتی تھی کہ پیٹ اور ایک دو اور آدمیوں کی مدد سے، جو اس کی اپنی بولی، افریقان، سمجھ سکتے تھے، انھیں احکام دے سکے۔ لیکن ان کی آوازوں کا شور شام کے اس وقت سے مخصوص تھا۔ ان بچوں میں سے جو ہمیشہ روتے رہتے تھے، کسی نے باریک آواز میں ریں ریں مچا رکھی تھی جس پر کوئی کان نہ دھر رہا تھا۔ ننگ دھڑنگ بچے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے کا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے جس کی وجہ سے کتا بھونک پڑتا تھا۔ وہ واپس آیا اور پائپ ختم کرنے کے لیے دوبارہ الاؤ کے پاس آ بیٹھا۔

کچھ وقفے کے بعد (اس وقفے کا وقت مقرر تھا، گو اس کا تعین کسی گھڑی کی مدد سے نہیں کیا جاتا تھا بلکہ بڑی دیر کی عادت کی بدولت یہ طے پاچکا تھا کہ اس کے غسل اور پائپ نوشی اور کھانا کھانے کے دوران میں کتنا کتنا وقفہ مناسب رہے گا) اس نے افریقان میں پکار کر کہا، ''میاں، میرے لیے کھانا بنانا بھول گئے کیا؟''

مڑے تڑے اندھیرے کے اس قطعے کے پار سے، جہاں دونوں آگوں کی روشنی آ کے ملتی تو نہ تھی مگر لڑکھڑاتی شکلیں اور ایک دوسرے پر بچھی ہوئی غف چمچماہٹیں بکھیر رہی تھی، ایک بھرایا ہوا، احتجاجی قہقہہ سننے میں آیا جو کسی نئی چہل کو داد سے نوازنے سے کہیں بہتر اس لیے تھا کہ آپس کے ایک پرانے مذاق کو وضع داری سے نباہے چلے جانے کے لطف کا حامل تھا۔

پھر چند منٹ بعد: ''پیٹ، میرا خیال ہے تم نے سب کچھ جلا کر رکھ دیا ہے، ہیں؟''

''باس؟''

''کھانا کہاں ہے، بابا؟''

کالا آدمی تہہ ہو جانے والی میز اور تیل سے جلنے والا لیمپ اٹھائے اپنے وقت پر نمودار ہوا۔ وہ روشنی اور اندھیرے میں آ جا کر، برتن اور رکابیاں اور کھانا اٹھا اٹھا کے لاتا اور گہری دل جمعی سے ملی جلی افریقان اور انگریزی میں چنکیاں بھرتا رہا۔ ''آپ کو تک سوسٹر (۱) مانگتا، سو میں کو تک سوسٹر بناتا۔ آپ آج سویرے مجھے بولا۔ سو مجھے تیل تیار کرنا پڑا، بڑھیا اور کڑ کڑاتا ہوا۔ مجھے ساری تیاری کرنا پڑا۔ اس لیے کام ذرا ہولے ہولے بنا۔ ہاں، مجھ کو معلوم پتا۔ مگر میں ہر کام جلدی جلدی تو کر نہیں سکتا۔ آپ آج رات جلدی مچایا۔ آپ انتظار کرنا نہیں مانگتا تو پھر بہتر یہ کہ آپ کو تک سوسٹر سینچر کو بنوایا کرو۔ تب مجھے سہ پہر کو فرصت ہوتی، میں اچھی طرح بناتا، ہاں، میرے خیال میں اگلی باری بہتر ہوگا کہ...''

پیٹ اچھا باورچی تھا۔ ''میں نے اپنے چھوکرے کو ہر چیز پکانی سکھا دی ہے،'' اُدھر فرانس ٹاؤن

(۱) چھوٹا، بلدار کیک جسے تیل میں تلتے ہیں۔

میں وہ نوجوان ہمیشہ لوگوں کو یہ سناتا رہتا۔ ''وہ تو کوئنگ سوسٹر تک بنالیتا ہے؛'' اس نے لڑکی کی ماں کو ان خاموشیوں میں سے ایک کے دوران میں بتایا جو اس کی نارضامندی کی دلیل تھیں اور جنھیں پُر کرنے میں اس قدر مشکل پیش آتی تھی۔ جس طرح کے رہن سہن کا وہ لڑکی کے لیے بندوبست کرسکتا تھا اس کی طرف سے لڑکی کے والدین بدظن تھے، اور ان کی بدظنی رفع کرنے کی کوشش میں اسے بڑی جان مارنی پڑی تھی۔ اس نے جوں توں کر کے والدین کو اس کا قائل تو کرلیا تھا کہ لڑکی کے لیے گزر بسر ناممکنات میں سے نہیں تھی، اور انھوں نے شادی کے لیے اپنی رضامندی بھی ظاہر کردی تھی، لیکن محسوس وہ اب بھی یہی کرتے تھے کہ اس طرح کی گزراوقات زیب نہیں دے گی۔ انھیں خوش کرنے اور اطمینان دلانے کی خواہش کے مارے وہ بے چین ہوکر صورت حال کا ان کی نظر سے جائزہ لیتا اور ان کے اعتراضات کا پہلے سے توڑ کرنے کے لیے تبدیلیاں عمل میں لاتا۔

لڑکی دیہاتی فارم کی رہنے والی تھی، اس لیے وہ شہری زندگی کے لیے تو نہ کلپتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ لڑکی کے والدین کے سامنے اس حقیقت سے انکار نہ کرسکا کہ کسی فارم پر رہنا، جہاں اس کا پورا کنبہ آس پاس ہو اور اڑوسی پڑوسی صرف تیس چالیس میل دور ہوں، اَور بات تھی اور کسی گاؤں یا شہر سے دوسو بیس میل دور، کسی سرراہ ڈیرے پر میاں کے ساتھ اکیلے رہنا بالکل مختلف معاملہ تھا، جہاں بقول اس کی ماں کے ''کالے کافروں کا غول کا غول دن بھر اسے گھیرے رہے گا۔'' نوجوان نے خود تو اس بارے میں سرے سے کچھ سوچا ہی نہ تھا کہ جب وہ سڑک بنوانے نکل جایا کرے گا تو اس کی غیر موجودگی میں لڑکی کیا کرے گی۔ جہاں تک لڑکی کا تعلق تھا، شادی ہوچکنے تک، اسے شادی کے سوا کسی بات کا ہوش نہ تھا، کہ کس طرح اس کی دو چھوٹی بہنیں گلابی کپڑے زیب تن کیے اس کے پیچھے پیچھے چلیں گی اور وہ عروسی لباس جو درزن سی رہی تھی اور جسے پہن لینے کی صورت میں اسے لگتا تھا کہ وہ خود کو پہچان نہ پائے گی اور وہ کیک جس کے اوپر چینی کے بنے ہوئے ننھے منے دولھا دلھن شام کا لباس ڈاٹے کھڑے ہوں گے۔

اس نے لکیریں پڑی میز اور جام کے کھلے ہوئے ٹین کی گگر اور نمک دانی پر نظر ڈالی، جس کے ٹوٹے ہوئے منھ پر بادامی کاغذ کا ٹکڑا اصفائی سے بندھا ہوا تھا، اور پیٹ سے کہا، ''جب بیگم صاحب آئیں گی تو تمھیں ہر کام عمدگی سے کرنا ہوگا۔''

''باس؟''

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور حقیقت میں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''تمھیں خاصہ قاعدے قرینے سے چلنا ہوگا اور ہر کام صاف ستھرا ہونا چاہیے۔''

''میں ہمیشہ ہر کام صاف ستھرا کرتا۔ تو پھر اب آپ کیوں بولتا کہ میں ضرور ہر کام صاف ستھرا

کروں؟''

نوجوان سر جھکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا جو اشارہ تھا کہ پیٹ اب جائے۔

کھانا کھاتے ہوئے اس کا ذہن خود بخود ان تبدیلیوں کا جائزہ لیتا رہا جو لڑکی کی خاطر عمل میں لانی پڑیں گی۔ وہ معاملات پر اس طرح غور کرنے کا عادی نہ تھا کہ ذہن میں ان کی تصویر کھنچ جائے بلکہ وہ صرف ان باتوں سے نمٹنا جانتا تھا جو سامنے موجود ہوں۔ یہ ایسا تھا جیسے اس نے کوئی سبق رٹ لیا ہو۔ اسے یہ تو علم تھا کہ جو کچھ درکار ہے اس کی کلی صورت کیا ہے۔ لیکن جب اجزائے ترکیبی میں سے کسی ایک کی تفصیل کا سامنا کرنا پڑتا تو اس کے چھکے چھوٹ جاتے۔ نہ تو وہ اس تفصیل کو پہچان پاتا اور نہ اس کی سمجھ میں آتا کہ اس سے کیوں کر نمٹے۔ مزدوروں کو لازمی طور پر ڈیرے سے دور رہنا ہوگا۔ سب سے اہم بات یہی تھی۔ پیٹ تو کھانا پکانے اور صفائی کرنے کی غرض سے ان کے ڈبے نما گھر میں بار بار آئے گا۔ مزدور بھی—خاص طور پر وہ مزدور جو لاریوں اور سڑک سازی کے آلات کی دیکھ بھال کے ذمے دار تھے—برابر کچھ نہ کچھ پوچھنے آتے جاتے رہتے تھے کہ فلانے بارے میں کیا کیا جائے، ڈھمکانے بارے میں کیا کیا جائے۔ وہ ایسا نہ کرتے تو سارا کام ہی چوپٹ ہو جاتا۔ چینی ہڈی کی ایک کرچ جو اس سے نگلی نہ گئی اس نے تھوک دی۔ اس کا ذہن کسی اور بات کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہ عورتیں جو اُدھر پرے تھیں—یہ لڑکی کے لیے کپڑے دھو دیا کریں گی۔ یہ کالے کافروں کی اس قدر ہوش ٹولی تھی، یہ لوگ کبھی کوئی کام سلیقے سے کر بھی پائیں گے؟ بیس مرد اور کوئی پانچ کے قریب ان کی عورتیں—یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ان سب کو کسی کٹیلے جھنکاڑ کے پیچھے لٹکا دیا جائے۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ اس کے ڈیرے کے آس پاس نہ ٹکے رہا کریں۔ یہ بات اچھی طرح ان کے پلے پڑ جانی چاہیے کہ وہ ڈیرے کے ارد گرد جمع نہ رہا کریں۔ اس کے الاؤ کی روشنی کی حد پر واقع نیم تاریکی میں پرچھائیاں پتلیوں کی طرح تھرک رہی تھیں اور اس نے نظر گاڑ کر ان پرچھائیوں سے پرے دیکھا۔ آوازیں، جو اَب یار باشی کے انداز میں دھیمی پڑ گئی تھیں، وقفے وقفے سے سنائی دیتی ہوئی، کہ کھانا کھایا جا رہا تھا، لکڑیاں چرنے کی ''چڑ!'' گونجتی ہوئی، اور کسی بچے کے بلک کر رونے کی باریک جھلی تنی ہوئی جس میں سے چھن کر یہ ساری صدائیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ لوگ اُدھر، اپنے احاطے میں تھے۔ اس کے باوجود اس نے ایک عجیب سا، کھٹکنے والا شک محسوس کیا۔

کھانا کھاتے وقت اس کے خیالات جس ست رو اور پر تعب انداز میں چکر پہ چکر کھاتے رہے، زندگی میں پہلے کبھی اس طرح کی کیفیت سے اسے سابقہ نہ پڑا تھا۔ وہ پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے زبان سے ایک دانت کو سہلایا۔ پینٹ، پیٹ، اس کافر کی زبان سالی بہت چلتی ہے۔ پیٹ جتنی دفعہ بھی پاس آئے گا، بولنے سے، بولتے چلے جانے سے باز کیسے رہے گا؟ اگر اس نے لڑکی سے باتیں کیں— بھئی، یہ تو

طے ہے کہ وہ لڑکی سے باتیں کرے گا — اس نے واقعی لفظ بہ لفظ یہ سوچا کہ اس بارے میں وہ پیٹ سے کیا کہے گا۔ یہ لفظ ان ناگفتنی باتوں کی طرح تھے جو لوگوں کی زبان پر تو کبھی نہیں آتیں لیکن خلوت کے لمحوں میں دیواروں پر اس خیال سے لکھ دی جاتی ہیں کہ ان پر دوسروں کی نظر پڑ جائے۔

پیٹ کافی اور کونک سوسٹر لے کے آیا اور نوجوان نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

لیکن کونک سوسٹر لذیذ، خستہ، چپ چپے اور میٹھے تھے اور جب اس نے زبان پر ان کا جانا پہچانا مال مسالہ اور ذائقہ محسوس کیا اور بیچ میں باری باری کافی کی گرم چرچراہٹ کا لطف لیتا رہا تو فی الفور اس خالص مسرت میں محو ہو گیا جو کھانے سے تعلق رکھتی ہے، جیسے بچہ مٹھائیوں سے بھری تھیلی میں پوری طرح منہمک ہو جاتا ہے۔ کونک سوسٹر اسے یہ معصوم اور مکمل لذت بہم پہنچانے میں کبھی ناکام نہ رہتے۔ جب وہ سڑک بنانے والے خلاصیوں کا نیا نیا اوورسیئر بنا تھا تو رات کے وقت اور اتوار کے دن اس پر گھنٹوں عجیب، بے قرار سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ بھوکا ہو۔ وہ کھانا کھاتا مگر کبھی سیر نہ ہوتا۔ وہ تمام وقت، کسی بھوکے ذی روح کی طرح ادھر سے ادھر ٹہلتا رہتا۔ ایک دفعہ اتوار کو تو سچ مچ ایسا ہوا کہ وہ اس چوکی کی طرف، جہاں مویشیوں کو کرم کش ادویہ ملے پانی سے نہلانے کا انتظام تھا، پیدل ہی چل دیا (دس ٹن والے ٹرک کو نجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بارے میں روڈ ڈپارٹمنٹ کا ضابطہ کچھ زیادہ ہی سخت تھا)۔ اس چوکی پر مویشیوں کی دیکھ بھال پر مامور سرکاری افسر اور اس کی بیوی کا مکان تھا، نلی دار لوہے کی چادروں کا بنا ہوا۔ وہ میاں بیوی بھی اس کی طرح افریقانز گورے تھے اور سڑک بنانے والوں کے پڑاؤ اور فرانسس ٹاؤن کے درمیان ان کے سوا گوری نسل کا کوئی اور آدمی موجود نہ تھا۔ چوکی وہاں سے چودہ میل دور تھی۔ راستہ ریتلا تھا۔ اتفاق سے اسی دن ان میاں بیوی نے بھی طے کیا کہ وہ گاڑی میں اس سے ملنے آئیں گے اور آدھے راستے سے ذرا کم پر انھوں نے اسے آلیا۔ اس وقت تک اس کی چال سست پڑ چکی تھی اور وہ گرمی سے تیورا چلا تھا۔ لیکن اس واقعے کے تھوڑے ہی عرصے بعد کھانا تیار کرنے اور اس کی ذات سے متعلق چھوٹے موٹے کام کاج کی ذمہ داری پیٹ نے سنبھال لی۔ اور ان ہدایات کی روشنی میں جو مویشیوں کے افسر کی بیوی نے نوجوان کو دی تھیں، پیٹ نے کونک سوسٹر بنانے بھی سیکھ لیے۔ کونک سوسٹر جو اس کے لیے بچپن کی ایک یادگار نعمت تھے جس سے اب وہ جب چاہے لطف اندوز ہو سکتا تھا اور یہ بات اس کے وہاں سکونت اختیار کر لینے پر راضی ہو جانے کی ابتدا تھی۔ اس کا وہ الگ تھلگ ڈیرا جینے کا ایک نجی قرینہ بن گیا جس میں اس کے اپنے مخصوص انتظامات اور ناز برداریوں کے سلسلے تھے۔

''پیٹ بابا! یارا! یہ تم نے کونک سوسٹروں کے ساتھ کیا ہاتھ کیا ہے، ہیں؟'' اس نے مسرت سے مغلوب ہو کر آواز دی۔

ایک پکار سنائی دی جس کا مطلب تھا ''ابھی آیا''، اور کالا آدمی، صافی سے ہاتھ خشک کرتا ہوا، ایسے شخص کا تذبذب آمیز، تمسخر بھرا انداز اپنائے ہوئے آ پہنچا جسے پتا ہو کہ اس نے اپنی پچھلی تمام کارگزاری کو مات دے دی ہے۔

''ان کوئنک سوسٹروں کو کیا ہو گیا ہے، میاں؟''

پیٹ نے کندھے اچکائے۔ ''آپ ہی مجھے بتا ڈالو۔ مجھے نہیں پتا کیا بات ہوئی۔''

''یہ لو، تھوڑے سے اَور لے کے آؤ، بھئی،'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے خالی پلیٹ اس کی طرف دھکیلی۔ اور جب پیٹ ہنستا ہوا وہاں سے چل دیا تو نوجوان نے آواز دے کر کہا، ''کوئنک سوسٹر ہمیشہ اسی طرح کے بنانے چاہئیں تمھیں، سمجھے؟''

اسے جشن تہوار کے موقعے پر، شادیوں میں یا کرسمس کے زمانے میں مے نوشی اچھی لگتی تھی لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو بلا ناغہ برانڈی پیتے ہیں۔ سنیچر کی سہ پہر کو، جب ہفتے بھر کا کام نمٹ جاتا، وہ دو گلاس برانڈی کے پیتا اور باقی تمام وقت شراب کی بوتل، جو وہ فرانسس ٹاؤن سے اس وقت لایا تھا جب وہ وہاں اسٹور کا سامان اٹھانے گیا تھا، خیمے میں اس کے صندوق میں پڑی رہتی۔ لیکن اس آخری رات کو وہ موج میں آ کر الاؤ کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور خیمے کا رخ کیا تاکہ بوتل لے آئے۔ (ایک کام اس نے کبھی نہیں کیا، یعنی یہ توقع ہی نہیں رکھی کہ ساقی کی خدمت کسی کالے کافر کو سونپی جا سکتی ہے — یہ تو ان کی للچاہٹ کو ضرورت سے زیادہ بھڑکانے کے مترادف ہوتا۔) ساتھ ہی وہ ایک گلاس بھی اٹھاتا لایا۔ اس کے پاس چھ گلاسوں کا سیٹ تھا جو سب بھینے رنگ کے نقلی منقش شیشے کے بنے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے لیے گھونٹ بھر برانڈی انڈیلی اور پاؤں وہاں تک پھیلا دیے جہاں وہ بوٹوں کے تلووں میں سے آگ کی گرماہٹ محسوس کر سکتا تھا۔ راتیں ٹھنڈی نہیں تھیں۔ پچھلے پہر دو تین بجے ہوا چلنے لگتی تو تب جا کے ٹھنڈ کا احساس ہوتا، لیکن ایک نتھار دینے والی خنکی فضا میں موجود تھی۔ وقتاً فوقتاً کالے لوگوں کے پڑاؤ کی طرف سے کوئی صورت آگ میں، جس کے شعلے ڈھے چلے تھے اور نیلے پڑ گئے تھے، لکڑی کا ایک اَور کندا جھونکنے ادھر آ نکلتی تھی۔ نوجوان کو اپنے اندر بھی اس طرح کی دھیمی پڑتی تابانی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے لیے تھوڑی سی برانڈی اور انڈیلی۔ گیدڑوں کی لمبی ہُو ہُو باہر آسمان کے گرد بھٹکتی پھر رہی تھی، جیسے ہوا کسی مکان کا طواف کرتی ہے۔ مکان تو وہاں کوئی نہیں تھا لیکن اس کا الاؤ لرز لرز کر اندھیرے میں جس روشنی کو بڑھاوا دے رہا تھا اس سے پرے سے آنے والی صداؤں نے — بے معنی آوازوں، بچوں کے رونے دھونے، کھانسنے اور کھنکھارنے کے اس ملغوبے نے — چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دی تھیں، سر چھپانے کے لیے چھت ڈال دی تھی۔ وہ پناہ کے بغیر تھا، کھلا پڑا تھا، دنیا کے کرے پر خلاے بسیط کی طرف

منھ کیے، ننگا دھڑنگا، مگر اسے اپنی اس حالت کا شعور نہیں تھا۔

طرح طرح کی ننھی منی موسیقی کی گتیں اندھیرے میں چھڑیں اور دم توڑ گئیں، منھ سے پھونکے گئے یا ہاتھ سے تار ہلا کر چھیڑے ہوے سروں کے لچھے جو آدمیوں کے بولنے چالنے کے شور میں دب کر معدوم ہو گئے۔ اتنے میں ایک لحیم شحیم آدمی، جس کے چوڑے چکلے کالے جثے سے اس کی گھسی پسی پتلون اور قمیص کی ہر سیون کھنچ کر مسک گئی تھی، قدم مار کے چلتا ہوا روشنی میں آیا۔ وہ آگ کے زیادہ نزدیک نہیں ہوا، بس آ کے روشنی کے دائرے میں بیٹھ گیا۔ بے تکلفی کے انداز میں آلتی پالتی مارے، پاؤں سمندر میں بہہ کر آنے والی لکڑیوں کی طرح پھٹے ہوے اور موسم زدہ۔ اس نے منھ سے ایک اکتارا لگا رکھا تھا جس کی شکل عود جیسی تھی۔ یہ باجا خمیدہ لکڑی کے ہلال کی مدد سے بنایا گیا تھا اور اس کے دونوں سروں کے درمیان تاڑ کے سوکھے پتے کی دھجی تنی ہوئی تھی۔ اس کے بڑے بڑے ہونٹ دھجی پر ملائمت سے دھرے تھے۔ پھونکنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ہاتھ سے تاڑ کے پتے کے ارتعاش کو قابو میں رکھ کر اپنے سانس کو ایک ننھی منی، مدھم اور کامل موسیقی کا روپ دے رہا تھا۔ انسان میں سماعت کی جو استعداد ہے اس کی کہیں بالکل اور چھور پر ہی یہ موسیقی سنائی دیتی تھی۔ وہ قوت سامعہ کی حدود سے قریب قریب ماورا تھی۔ شاید وہ اولیں موسیقی اس آواز سے مشابہت رکھتی ہوگی جو انسانوں نے اُس وقت کبھی سنی ہوگی جب انھوں نے دریا کنارے سینٹھوں کے درمیان سیدھے کھڑے ہونے کا آغاز کیا ہوگا۔ جب وہ تھم گئی تو یہ جاننا دشوار تھا کہ وہ درحقیقت کس نقطے پر آ کر معدوم ہوئی تھی۔

''وہ دوسری والی دھن بجاؤ،'' نوجوان نے تسوانا بولی میں کہا۔ صرف اس کے پائپ سے اٹھنے والے دھویں میں حرکت پیدا ہوئی۔

گلابی ہتھیلیوں والے ہاتھ باجے کے گرد جم گئے۔ موٹے، ملائم ہونٹ پھر سے تر ہوے۔ مدھم اجاڑ آواز پھر آنے لگی، اس درجہ سنسان موسیقی کہ وہ سازندے اور سامع تک یوں پہنچتی تھی جیسے وہ اسے اپنے اندر کہیں سن رہے ہوں۔ اس بار سازندے نے دوسرے ہاتھ میں چھوٹی سی ڈنڈی تھام لی اور پھونکنے کے ساتھ ساتھ اسے عود کے خم کی اندرونی طرف رگڑنے لگا جہاں کٹے ہوے دندانوں سے ایک روکھا، تھرکتا ہوا اور رپٹواں شور پیدا ہوا جیسے دور کہیں سے ناچنے والوں کے قدموں کی آواز آ رہی ہو۔ جہاں آگ کا اجالا اندھیرے میں مدغم ہو رہا تھا وہاں دو تین وجود اور تھے جو پرچھائیوں کے مقابلے میں زیادہ بھرے بھرے نظر آ رہے تھے۔ وہ آگے آئے اور اکڑوں بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک کے پاس پیرافین کا ادھ کٹا ٹین تھا جس کی گردن لکڑی کی تھی۔ ٹین، تانت اور تار کے دیگر لوازم سے آراستہ تھا۔ جب عود نواز رُکا اور اس نے، اُتار کے عالم میں، چوبی مضراب اور پتے کو منھ سے الگ کیا اور ہاتھ کی پشت سے ہونٹ پونچھنے لگا تو دوسرے

آدمی نے اپنا باجا چھیڑا۔ وہ بینجو پر بجائی جانے والی دھن تھی، تکرار سے پُر، تنتناتی ہوئی۔ نوجوان تال دینے کے لیے بوٹ سے ریت کو دھپ دھپاتا رہا اور ایک دو بار اس نے تالی بجا کر بھی دھن کا ساتھ دیا۔ ایک دبلا پتلا آدمی، رنگت پیلی پیلی، پرانا سا ہیٹ اوڑھے، پھبتیوں اور طعنوں کا سامنا کرتا، دوسروں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے آیا اور، دوزانو بیٹھ کے، قدموں کے بیچ میں مٹی کا چھوٹا سا پیالہ رکھ لیا جس کے منھ پر فلزاتی پردوں پر مشتمل ایک کی بورڈ بنا ہوا تھا۔ قدرے نوک جھونک کے بعد اس نے باجا بجانا شروع کیا اور دوسرے مدھم سروں میں گنگنانے لگے۔ ان کے گانے کی آواز سن کر چند اور آدمی، جو چہل قدمی کر رہے تھے، آگ کی طرف کھنچ آئے۔ موسیقی خوشگوار انداز میں تمام ہوئی اور پھر، گویا سانس لے کر، دوبارہ شروع ہوگئی۔ انھی وقفوں میں سے ایک کے دوران میں نوجوان نے کہا، "لاؤ، اس تمھارے گورکھ دھندے کو ذرا دیکھیں تو سہی۔ یہ نئی چیز بنائی ہے نا؟" اور جس آدمی کی طرف اس نے اشارہ کیا وہ سمجھ تو نہ سکا کہ اس سے کیا کہا جارہا ہے، لیکن اس نے پیرافین کے ٹین سے بنے ہوئے مینڈولن کو جس انداز سے نوجوان کے حوالے کیا وہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے اپنی دستکاری پر ناز بھی ہے اور ہنسی بھی آرہی ہے۔

نوجوان نے سر ہلاتے ہوئے، مسکراتے ہوئے، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، ایک بار تاروں کو چھیڑا۔ تانت کے ذرا سے ٹکڑے اور جام کا کوئی پرانا ٹین ملنے کی دیر ہے، یار، یہ پورا بینڈ باجا تیار کرلیں گے۔ اس نے انھیں بعض اول جلول چیزیں بجاتے سنا تھا۔ چہروں کا دائرہ محظوظ ہو کر اسے تکتا رہا۔ وہ ہنستے گئے اور آلکس بھرے انداز میں آپس میں کہتے رہے: بے شک، یہ باجا ہے تو الل ٹپ، مگر کام دے جاتا ہے۔ باجے والے نے باجا واپس لیا اور تھوڑے سے مسخرے پن کے بعد اسے بجانے لگا۔ سامعین ہنس دیے اور اس طرح کا ہنسی مذاق کرنے لگے جس سے تحسین کا پہلو نکلتا تھا۔ اب وہ آگ کے بالکل نزدیک سرک آئے تھے، جس نے انھیں اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ "اگلے ہفتے" نوجوان نے مگن ہو کر زور سے کہا، "اگلے ہفتے جب میں واپس آؤں گا تو ساتھ میں ریڈیو لاؤں گا۔ ڈھیر ساری سچ مچ کی موسیقی، تمام نامی گرامی گورے بینڈ اس پر سنے جاسکتے ہیں۔" کسی نے، جو کبھی جو ہانسبرگ میں ملازمت کرچکا تھا، "ساچمو" (۱) کہا اور دوسروں نے اس کی بات آگے بڑھائی۔ وہ سمجھ گئے کہ گورا شہر سے جو چیز لے کر آئے گا اس کے لیے لفظ یہی تھا۔ ساچمو۔ ساچ مو۔ انھوں نے شائستگی کے ساتھ لفظ ادا کر کے دیکھا۔ "موسیقی، بالکل ویسی ہی جیسے شہر میں بڑے گورے ناچ کے موقع پر ہوتی ہے۔ اگلے ہفتے۔" ایک دوستانہ، تحسین آمیز خاموشی چھا گئی اور وہ سب آگ کی گرماہٹ میں آرام سے بیٹھے اسے مروت آمیز نظر سے دیکھتے رہے۔ اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ اسے جلن محسوس ہوئی۔ پہلے اس کی گردن جل اٹھی، پھر اس کے کان اور

---

(۱) مشہور امریکی سیاہ فام موسیقار لوئی آرم سٹرونگ کا لقب۔

چہرہ تپنے لگا۔ ظاہر ہے، اس وعدے سے فرق تو کوئی پڑتا نہیں تھا۔ اگلے ہفتے تک وہ یہ بات بھول چکے ہوں گے۔ انھیں اس کی توقع بھی نہ رہے گی۔ اس نے ذہن میں اس منظر پر پردہ گرادیا کہ وہ ریڈیو سننے کے لیے ڈبے نما گھر کے اردگرد جمع ہیں اور وہ باہر آ کے سیڑھیوں پر کھڑا ہو جاتا ہے انھیں بتانے کے لیے کہ —

اس نے لمحے بھر کے لیے سوچا کہ برانڈی کی بوتل کی بچی کھچی شراب انھیں دے جائے۔ ارے توبہ، نہیں یار، یہ تو پاگل پن ہوگا۔ اگر انھیں اس شے کا چسکا پڑ گیا تو پھر پورے وقت اسے چراتے ہی رہیں گے۔ وہ اسٹور میں سے پیٹ کو تھوڑی سی شکر اور خمیر اور دوسری چیزیں دے جائے گا تاکہ کل اس کے جانے کے بعد وہ بیئر بنالیں۔ اس نے ہاتھ جیبوں میں خوب اندر تک گھسا دیے اور سر سینے پر نہوڑا کر آگ کے رخ پسر گیا۔ عودنواز نے لکڑی کی بنی ہوئی اپنی کا جو بھوجو بست پھر اٹھالی اور یوں لگا کہ نوجوان جو کچھ اپنے جی میں محسوس کر رہا تھا اسے اپنے اظہار کے لیے آواز مل گئی ہو، اس کے سینے سے یوں باہر آتی ہوئی آواز جیسے پیچ در پیچ کھل رہی ہو، تسکین بخشتی ہوئی، الاؤ سے پرے رات میں اٹھتی پھیلتی ہوئی۔ عود کی سنسان آواز آتی رہی، آتی رہی، جیسے کہیں لامحدود میں سے سنائی دے رہی ہو اور کسی مقام پر پہنچ کر پھر لامحدود میں جذب ہو جائے گی۔ سب چپ تھے کہ زبانوں کی اڑچنوں کو خاموشی نے ڈھادیا تھا۔ پریشانی اور منصوبہ بندی کا سارا گدلا دھارا نوجوان میں سے چھن کر باہر بہہ گیا تھا۔ چھوٹا، بلند چاند، جس کی چمک ٹھنڈے ستاروں کی نیلی بکھیر کے آگے ماند پڑ گئی تھی، عود کی شکل کو دہرا رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کب تک اس عالم میں وہاں بیٹھا رہا کہ اس کے سر پر ستارے تھے اور قدموں میں آگ تھی۔ ایسی کتنی ہی دوسری راتوں کو بھی وہ اسی طرح بیٹھا رہا تھا۔

لیکن آخر کار موسیقی ختم ہوگئی اور وقت لوٹ آیا۔ یہ آج کی رات تھی۔ پھر کل کا دن تھا جب وہ فرانسس ٹاؤن جائے گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجمع تتر بتر ہوگیا۔ عود بجانے والے نے انگلیوں کی مدد سے ناک سنکی۔ دھول میں اٹے پیروں نے اپنا جانا پہچانا بوجھ اٹھایا۔ انھوں نے اپنے خیموں کا رستہ لیا اور اس نے اپنے خیمے کا رخ کیا۔ مدھم سی سائیں سائیں ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ نوجوان نے منھ پھاڑ کر بھونڈی سی، جانوروں جیسی، جمائی لی: یہ اس قسم کا بے حجابانہ شور تھا جو مرد اُس وقت مچا سکتا ہے جب وہ اکیلا رہتا ہو۔ وہ ریت پر بہت آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن اسے راستے کی ایسی پہچان تھی کہ آنکھوں سے دیکھ نہ پانا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ خیمے پر پہنچ کر اس نے چلا کر کہا، ''پیٹ! ہوت! تم کل سویرے جلدی اٹھ جانا، ہیں؟ اور میں یہ سننا نہیں چاہتا کہ لاری اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔ تم اسے اسٹارٹ کر دینا اور پھر مجھے بلانا۔ سن لیا تم نے؟''

وہ تیل والا لیمپ جلانے لگا جسے پیٹ مچن کر کے صندوق پر رکھ گیا تھا اور لیمپ جوں ہی سیج سے

روشن ہوا تو ساتھ ہی خیمے کا سارا اندرون بھی سامنے آ گیا___ صندوق، پلنگ، گھڑی اور سترہ سال کی لڑکی کا شرمیلا، متبسم چہرہ۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلیوں کو کمبل کے ریشمی پوستین میں پھسل جانے دیا۔ اس نے سانس لیا، لمحے بھر کے لیے اسے روکے رکھا، چاروں طرف کچھ ٹھان لینے کے انداز میں دیکھا اور پھر اس نے فوٹو گراف کو اٹھایا، اس کے گتے کی ٹیک تہہ کر کے فریم سے ملادی اور اپنی باقی دوسری چیزوں کے ساتھ اسے بھی صندوق میں رکھ دیا، سفر کے لیے تیار۔

کونستنتائن کوافس

دن دہاڑے

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں شام گئے رملہ میں سان ستیفانو کسینو میں ڈنر کھا کے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے دوست الیگزینڈر اے نے، جو کسینو ہی میں مقیم تھا، مجھے اور ایک اور نوجوان کو، جو ہم دونوں کا گہرا دوست تھا، رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چوں کہ اس رات کسینو میں موسیقی کا اہتمام نہ تھا اس لیے بہت کم لوگ آئے تھے اور ہم تینوں وہاں یوں ڈٹے ہوئے تھے جیسے اس جگہ پر ہمارے سوا کسی کا حق نہ ہو۔

متفرق موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔ چوں کہ ہم میں سے کوئی متمول نہیں تھا اس لیے بالکل قدرتی طور پر گفتگو کا رخ اس طرف مڑ گیا کہ دولت پاس ہو تو آدمی خود کو کتنا آزاد محسوس کرتا ہے اور نتیجتاً زندگی کے کیسے کیسے مزے لوٹ سکتا ہے۔

ہمارے نوجوان دوست نے کہا کہ وہ تیس لاکھ فرانک حاصل کرنا چاہے گا، اور پھر بتانا شروع کیا کہ ایک بار یہ زرِ خطیر اس کے ہاتھ آجائے تو وہ کیا کیا کرے گا اور مستزاد یہ کہ کیا کیا نہیں کرے گا۔ میں نے زیادہ منکسر مزاجی سے حساب لگا کر بتایا کہ میرا گزارا بیس ہزار فرانک سالانہ میں ہو جائے گا۔

الیگزینڈر اے کہنے لگا، ''اگر میں چاہتا تو آج میرا اثاثہ خدا جانے کتنے لکھ پتیوں کے برابر ہوتا، مگر میری ہمت جواب دے گئی۔''

ہم نے سوچا کہ یہ کیسی عجیب وغریب بات کہی گئی ہے۔ ہم اپنے دوست اے کی زندگی کے حالات سے پوری طرح واقف تھے اور ہمیں یاد نہ آتا تھا کہ اسے کبھی یہ موقع فراہم کیا گیا ہو جس سے فائدہ اٹھا کر وہ کئی لکھ پتیوں جتنا امیر ہو جاتا۔ اس لیے ہم نے فرض کیا کہ یہ بات اس نے رواروی میں کہہ دی ہے اور اب کوئی لطیفہ سننے کو ملے گا۔ لیکن ہمارے دوست کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی اور ہم نے اس سے کہا کہ وہ اپنی اسرار آمیز بات کی وضاحت کرے۔

وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکا۔ پھر بولا، ''کسی اور محفل میں، مثال کے طور پر ان لوگوں کے درمیان جو

خود کو 'بالغ نظر' کہتے ہیں، میں اپنے کہے کی وضاحت نہ کرتا کیوں کہ وہ مجھ پر ہنسنے لگتے۔ ہم، بہر حال، خود کو ان نام نہاد بالغ نظر حضرات سے قدرے بلند تر سمجھتے ہیں؛ یعنی ہم اپنی کامل روحانی ترقی کی بدولت پھر سے سادگی کی طرف لوٹ آئے ہیں، مگر ایسی سادگی کی طرف جس میں بے علمی کو دخل نہیں۔ ہم نے دائرہ طے کر لیا، سو قدرتی طور پر ہم وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔ باقی لوگ آدھے راستے تک پہنچے ہیں۔ انھیں نہ تو پتا چل سکتا ہے اور نہ ان کے تصور میں آسکتا ہے کہ راستے کہاں پہنچ کر ختم ہوتے ہیں۔"

اس کی باتیں سن کر ہم ذرا نہ چونکے۔ ہم میں سے ہر کوئی اپنے اور باقی دونوں کے بارے میں یہی سمجھتا تھا کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔

"ہاں،" الیگزینڈر نے دہرایا۔ "اگر میں ہمت سے کام لیتا تو کروڑ پتی ہو جاتا۔ لیکن میں ڈر گیا۔

"یہ دس برس پہلے کا قصہ ہے۔ آج کی طرح تب بھی میرے پاس کوئی خاص روپیہ پیسہ نہ تھا، یا یوں کہیے کہ بالکل ہی نہ تھا۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح میرا وقت کٹ رہا تھا اور ہر لحاظ سے میرے مزے ہی مزے تھے۔ شارع شریف پاشا پر میرا قیام تھا۔ مکان کی مالکہ ایک بیوہ اطالوی تھی۔ میرے پاس قرینے سے سجے سجائے تین کمرے تھے، ذاتی ملازم تھا۔ مکان دارنی اس کے علاوہ، جسے میرے آرام کا اتنا خیال رہتا تھا کہ کوئی حد نہیں۔

"ایک شام میں روسینی کی تماشا گاہ چلا گیا۔ کافی الابلا سنگیت سننے کے بعد میں نے طے کیا کہ بیچ ہی میں سے اٹھ چلتا ہوں تاکہ گھر جا کر سو رہوں۔ اگلی صبح جلد اٹھنا تھا کیوں کہ یار لوگوں کی ایک منڈلی سیر سپاٹے کی غرض سے ابو قیر جانے والی تھی اور مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔

"کمرے میں پہنچ کر میں نے، حسب معمول، دن کے دوران میں پیش آنے والے واقعات پر غور کرتے ہوئے، ادھر ادھر ٹہلنا شروع کیا۔ لیکن دن میں جو کچھ ہوا تھا وہ دلچسپی سے خالی تھا۔ مجھے غنودگی نے آ لیا اور میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

"میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے سویا ہوں گا۔ اس دوران میں کوئی خواب دکھائی نہیں دیا۔ خیال آتا ہے کہ آدھی رات کے گھنٹے بھر بعد سڑک پر ہونے والے کسی شور سے میری آنکھ کھل گئی تھی، اور کوئی خواب دیکھنا مجھے یاد نہیں۔ ڈیڑھ بجے کے قریب مجھے دوبارہ نیند آ گئی۔ اور پھر یوں لگا جیسے کوئی درمیانے قد کا آدمی، جو چالیس کے پیٹے میں ہوگا، میرے کمرے میں آیا ہے۔ وہ کالے رنگ کے ذرا پرانے سے کپڑے اور تنکوں کا بنا ہوا ہیٹ پہنے تھا۔ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی جس میں بہت بڑا زمرد جڑا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ انگوٹھی خاص طور پر اس کے باقی حلیے سے کوئی مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس کی کالی داڑھی میں کہیں کہیں سفید دھاریاں تھیں اور دیکھنے کا انداز کچھ عجیب تھا کہ چتون سے بیک وقت تمسخر بھی ٹپکتا تھا اور غمگینی بھی۔

بہر حال، مجموعی طور پر، وہ خاصا عام سا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ بالکل اس جیسے آدمی بار بار دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اسے مجھ سے کیا کام ہے۔ اس نے بلا تامل جواب نہ دیا بلکہ منٹ بھر مجھے گویا شبہے کی نظر سے دیکھتا رہا، یا شاید یہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ اس سے کوئی بھول چوک تو نہیں ہوئی۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ اس کا لہجہ مسکین اور خوشامدانہ تھا۔

''مجھے معلوم ہے آپ غریب ہیں۔ میں آپ کو امیر ہونے کا طریقہ بتانے آیا ہوں۔ پومپئی کی لاٹھ کے پاس مجھے ایک جگہ کا پتا ہے جہاں بہت بڑا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ اس خزانے سے مجھے خود کچھ نہیں چاہیے۔ صرف لوہے کی ایک صندوقچی لوں گا جو خزانے کی بالکل تہہ میں رکھی ہے۔ باقی جو ہے وہ سارے کا سارا آپ کا ہوگا۔''

'''اور اس بہت بڑے خزانے میں کیا کیا ہے؟' میں نے دریافت کیا۔

'''اشرفیاں ہیں،' وہ بولا۔ 'لیکن اصل بات یہ کہ جواہرات ہیں۔ دس یا بارہ سونے کے صندوق ہیں جو ہیروں اور موتیوں اور میرے خیال میں؛ جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو، 'نیلموں سے پر ہیں۔'

''میں حیران ہوا کہ جو کچھ اس کو درکار ہے اسے لینے کے لیے آخر وہ خود ہی کیوں نہیں چلا جاتا اور اسے میری ضرورت کیوں پڑ گئی ہے۔ میں یہ سوال کرنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے جواب دیا، 'میں آپ کے خیالوں کو پڑھ سکتا ہوں۔ آپ حیران ہیں کہ جو کچھ مجھے درکار ہے وہ میں خود ہی جا کر کیوں نہیں لے آتا؟ اس کی ایک وجہ ہے جو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ اسی وجہ سے یہ کام میرے بس کا نہیں۔ بعض کام ایسے ہیں جنھیں ابھی میں بھی نہیں کر سکتا۔' 'میں بھی' کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک پیدا ہوئی اور ثانیے بھر کے لیے اس کے وجود پر ایک مہیب شوکت طاری ہوگئی جیسے اس کی کایا پلٹ گئی ہو۔ لیکن فوراً ہی اس نے وہی مسکین انداز دوبارہ اختیار کر لیا۔ 'یوں آپ میرے ساتھ چل کر مجھ پر بڑا احسان کریں گے۔ مجھے کسی آدمی کی اشد ضرورت ہے اور میں نے آپ کو اس لیے چنا کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ کل مجھ سے ملیے۔ میں دوپہر بارہ بجے سے سہ پہر چار بجے تک اس کیفے میں آپ کا انتظار کروں گا جو زقاق صغیر میں لوہاروں کی بٹیوں کے پاس واقع ہے۔'

''اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

''صبح جب میں جاگا تو یہ خواب میرے ذہن سے بالکل محو ہو چکا تھا۔ لیکن جب نہا دھو کر ناشتہ کرنے بیٹھا تو ذہن میں تازہ ہو گیا اور بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔ 'کاش یہ حقیقت ہوتا،' میں نے دل میں کہا اور دوبارہ اسے بھول گیا۔

''میں اس ٹولی کے ساتھ ہو لیا جو سیر سپاٹے کی غرض سے دیہات جا رہی تھی اور وہاں خوب گمت

رہی۔ ہمارا خاصا بڑا گروہ تھا۔ کوئی تیس مرد عورت ہوں گے اور سب پر غیر معمولی شگفتگی غالب تھی۔ میں سیر کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا کیوں کہ وہ ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔''

یہاں میرے دوست ڈی نے کہا، ''اور انھیں بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ کم از کم مجھے تو وہ پہلے ہی معلوم ہیں۔ اگر مجھے غلط یاد نہیں تو اس سیر و تفریح میں تو میں بھی شریک تھا۔''

''تم بھی تھے؟ مجھے تمھارا ساتھ جانا یاد نہیں آرہا۔''

''یہ وہی سیر نہیں جس کا بندوبست مارکوس جی نے کیا تھا اور جس کے فوراً بعد وہ ہمیشہ کے لیے انگلستان چلا گیا تھا؟''

''ہاں، یہ وہی سیر تھی۔ پھر تو تمھیں یاد ہوگا کہ ہم نے کتنے مزے لوٹے تھے۔ کیا کمال کا وقت تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ایسا وقت جسے بیتے مدتیں ہو چکیں۔ ہر کمال کا وقت مدتوں پہلے ہی کی بات لگتا ہے۔ لیکن میں اپنی کہانی کی طرف لوٹتا ہوں۔ سیر و تفریح سے واپس آیا تو بری طرح تھکا ہوا تھا اور دیر بھی خاصی ہو چکی تھی۔ مشکل سے کپڑے بدلنے اور کھانا کھانے کا وقت ملا۔ اس کے فوراً بعد میں چند دوستوں کے ہاں چلا گیا جہاں کچھ اس طرح کا اہتمام تھا کہ صرف گھر والے رات کو بیٹھ کر آپس میں تاش کھیلیں گے۔ میں وہیں ٹک گیا اور ڈھائی بجے تک تاش کھیلتا رہا۔ میں نے ڈیڑھ سو فرانک جیت لیے اور بہت خوش خوش گھر لوٹا۔ بالکل نچنت ہو کر بستر میں جا لیٹا۔ دن بھر گھومنے پھرنے اور اتنی دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے ماندہ تو تھا ہی، فی الفور آنکھ لگ گئی۔

''لیکن میں ابھی سویا ہی تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ مجھے کمرے میں روشنی جلتی نظر آئی اور میں تعجب ہی کر رہا تھا کہ میں نے لیٹنے سے پہلے اسے بُجھایا کیوں نہیں کہ دور اُدھر سے جس طرف دروازہ تھا (میرا کمرہ خاصا بڑا تھا) ایک شخص نمودار ہوتا دکھائی دیا جسے میں فوراً پہچان گیا۔ اس نے وہی کالے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سر پر وہی تنکوں کا ٹوپ تھا۔ ویسے وہ خفا نظر آرہا تھا اور مجھ سے کہنے لگا، 'میں کیفے میں دوپہر بارہ بجے سے چار بجے تک تمھارا انتظار کرتا رہا۔ تم آئے کیوں نہیں؟ میں نے تم پر ہُن برسانے کی پیش کش کی ہے اور تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آج سہ پہر میں اسی کیفے میں دوپہر سے چار بجے تک پھر تمھاری راہ دیکھوں گا۔ وہاں ضرور بالضرور پہنچ جانا۔'

''اتنا کہہ کر وہ پچھلی رات کی طرح نظر سے اوجھل ہو گیا۔

''لیکن اس بار میں دہشت زدہ ہو کر جاگ اٹھا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے لیمپ روشن کیا۔ خواب اس قدر حقیقی اور زندہ تابندہ تھا کہ میں بالکل ہول زدہ اور حواس باختہ ہو کر رہ گیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اٹھ کر دیکھا کہ دروازہ مقفل ہے یا نہیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح مقفل تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی

تو پتا چلا کہ ساڑھے تین بجے ہیں۔ میں تین بجے سونے لیٹا تھا۔

''میں تم سے یہ چھپانا نہیں چاہتا اور نہ مجھے یہ تسلیم کرتے ہوئے کوئی شرمندگی محسوس ہوتی ہے کہ میں بری طرح سہم گیا تھا۔ مجھے آنکھیں بند کرنے سے ڈر لگ رہا تھا کہ مبادا نیند آتے ہی پھر اس طرفہ معجون ملاقاتی سے سابقہ پڑ جائے۔ میں اضطراب کے عالم میں کرسی پر جا بیٹھا۔ کوئی پانچ بجے کے قریب دن نکلنا شروع ہوا۔ میں نے کھڑکی کھولی اور سڑک پر رفتہ رفتہ بیداری کے آثار نمایاں ہوتے دیکھے۔ چند ایک دروازے کھل چکے تھے اور سب سے پہلے نکل پڑنے والے چند ایک گوالے اور نانبائیوں کے ٹھیلے آ جا رہے تھے۔ اجالے نے کسی نہ کسی طرح مجھے سکون بخشا۔ میں دوبارہ لیٹ گیا اور نو بجے تک سویا رہا۔

''جاگنے کے بعد جب میں نے ان خلجانوں کو یاد کیا جنھوں نے رات مجھے گھیر لیا تھا تو ان کی اثر انگیزی کی بیشتر شدت کافور ہونے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں دنگ رہ گیا کہ میں نے بڑ بڑا کر اپنا ایسا برا حال کر لیا تھا۔ ڈراؤنے خواب تو سبھی دیکھتے ہیں۔ میں بھی زندگی میں بہتیرے ڈراؤنے خواب دیکھ چکا ہوں۔ علاوہ ازیں جو کچھ میں نے دیکھا تھا اسے تو ڈراؤنا خواب بھی مشکل ہی سے قرار دیا جا سکتا تھا۔ یہ درست تھا کہ میں نے وہی خواب دوبارہ دیکھا، لیکن اس سے ثابت کیا ہوا؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا میں نے واقعی دو مرتبہ خواب دیکھا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں نے اسی آدمی کو دوسری مرتبہ دیکھنے کا خواب ایک بار دیکھا ہو؟ اپنا چیتا احتیاط سے ٹٹولنے کے بعد میں نے یہ خیال رد کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ خواب میں پرسوں رات دیکھ چکا تھا۔ پھر بھی یہ ایسی کون سی انہونی بات تھی؟ بظاہر پہلے خواب نے اپنی زندہ تابی کے باعث مجھ پر بہت گہرا اثر مرتب کیا ہوگا، اسی بنا پر وہ مجھے دوبارہ دکھائی دیا۔ خیر، یہاں پہنچ کر میری منطق ذرا لڑکھڑانے لگی۔ اصل میں مجھے یاد نہ آتا تھا کہ پہلے خواب نے مجھ پر کوئی خاص تاثر چھوڑا ہو۔ اگلے پورے دن مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔ سیر و تفریح کے دوران میں، رات کو تاش کی پارٹی پر، اس خواب کے سوا، میرے ذہن میں ہر وہ بات آئی جو سوجھ سکتی ہے۔ پھر ثابت کیا ہوا؟ کیا خوابوں میں اکثر وہ لوگ نظر نہیں آ جاتے جن سے ملے سالہا سال گذر چکے ہوتے ہیں یا جنھیں ہم نے مدتوں سے یاد بھی نہیں کیا ہوتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تمثال ہماری روح میں کہیں نہ کہیں نقش ہو جاتی ہے اور اچانک کسی خواب میں از سر نو عود کر آتی ہے۔ اگر میں نے چوبیس گھنٹے کے عرصے میں وہی خواب دوبارہ دیکھا، خواہ دن کے وقت وہ مجھے یاد بھی نہ رہا ہو، تو اس میں حیرت کی کیا بات تھی؟ اس کے علاوہ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ شاید کسی خفیہ خزانے کے بارے میں کچھ کہیں میری نظر سے گذرا ہو جس نے میرے حافظے میں یہ گل کھلایا۔ لیکن بہتیری سوچ بچار کے باوجود اس طرح کا کوئی متن یاد نہ آ سکا۔

''آخر، سوچتے سوچتے تھک جانے کے بعد، میں نے کپڑے بدلنے شروع کیے۔ مجھے ایک شادی

میں شرکت کرنی تھی۔ ایک تو عجلت اور پھر یہ فکر کہ کیا پہنا جائے؛ چناں چہ خواب مکمل طور پر میرے ذہن سے دور ہوگیا۔ پھر میں نے ناشتہ کیا اور وقت گذارنے کے لیے جرمنی سے شائع ہونے والا ایک جریدہ، میرے خیال میں 'بیسپورس' پڑھتا رہا۔

"میں شادی میں شریک ہوا جہاں شہر کے بالائی طبقے کے بھی چیدہ چیدہ لوگ جمع تھے۔ ان دنوں میرے مراسم بہت زیادہ تھے۔ چناں چہ شادی کی رسم ادا ہونے کے بعد مجھے بے شمار بار یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ دلھن حسین ہے، گو ذرا سی پیلی نظر آرہی ہے، اور دلھا نہایت عمدہ جوان ہے اور امیر بھی ہے اور یہ بھی ہے اور وہ بھی ہے۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے تقریب اختتام کو پہنچی اور وہاں سے اٹھ کر میں بلکلے اسٹیشن چلا گیا جہاں میرے سننے میں آیا تھا کہ ایک مکان دستیاب ہے اور میں چاہتا تھا کہ اگر ممکن ہو تو اسے قاہرہ میں مقیم ایک جرمن خاندان کے لیے، جو گرمیوں کے دن اسکندریہ میں گزارنے کا سوچ رہا تھا، کرائے پر حاصل کرلیا جائے۔ مکان فی الواقع بہت پُر فضا اور خوش قطع تھا مگر جتنا مجھے بتایا گیا تھا اس کی بہ نسبت چھوٹا ثابت ہوا۔ تاہم میں نے مکان دارنی سے وعدہ کیا کہ لکھ دوں گا، مکان موزوں ہے۔ ڈھیر سارا شکریہ ادا کرنے کے بعد، میرے دل کو پانی کرنے کے لیے، خاتون نے اپنی تمام اگلی پچھلی کلفتوں کا ذکر چھیڑ دیا اور بتایا کہ اس کے خدا بخشے میاں کا کیسے اور کب انتقال ہوا تھا اور یہ کہ وہ یورپ تک کا چکر لگا آئی تھی اور اس قماش کی عورت نہیں تھی جو اپنا مکان کرائے پر چڑھاتی رہتی ہو اور اس کا باپ فلانے پاشا کا، جس کا نام بھی اب مجھے یاد نہیں رہا، طبیب تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اس فریضے سے فارغ ہو کر میں نے شہر کی راہ لی۔ کوئی ایک بجے اپنے فلیٹ پہنچا اور خوب ڈٹ کر نہار تناول کیا۔

"کافی نوش کرنے کے بعد میں ایک دوست کی طرف چل دیا جس کا ہوٹل کیفے پارادیسو کے پاس تھا۔ مقصد یہ تھا کہ سہ پہر گزارنے کا کوئی بندوبست کیا جائے۔ اگست کا مہینہ تھا اور سورج آگ برسا رہا تھا۔ میں شارع شریف پاشا سے آہستہ آہستہ اترا، تاکہ پسینے میں شرابور ہونے سے بچا رہوں۔ دن کے اس وقت سڑک ہمیشہ سونی پڑی ہوتی تھی۔ راہ میں صرف ایک وکیل سے ملاقات ہوئی جسے میں نے محرّم بے میں واقع زمین کے ایک مختصر سے قطعے کی فروخت کے بارے میں کاغذات تیار کرنے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ ایک اچھی خاصی جائیداد کا، جسے میں اپنے بعض اخراجات پورے کرنے کی خاطر تھوڑا تھوڑا کر کے بیچتا رہا تھا، یہ قطعہ آخری جز تھا۔ وکیل تھا تو ایمان دار آدمی، اور اسی لیے میری نظر انتخاب اس پر پڑی تھی، مگر باتونی حد سے زیادہ تھا۔ اس کی الا بلا باتیں سننے کی بجائے، جن کی بے لطفی سے دماغ پلپلا ہو کر رہ جاتا تھا، کسی دھوکے باز کے ہاتھوں تھوڑا سا چرکا کھالینا بہتر ہوتا۔ ذرا سا اشارہ ملتے ہی اس نے ایک لامتناہی تقریر شروع کردی۔ تجارتی قانون اور رومی قانون پر بات کی، جستی نیان کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیا، ان پرانے پرانے

مقدموں کا حوالہ دیا جو اس نے سمرنا میں لڑے تھے، خود کو سراہا، ہزار ہا الم غلم باتوں کی گرہیں کھول ڈالیں اور حد یہ کہ میرے گریبان کی لوٹ پکڑ لی، اور یہ ایسی حرکت ہے جس کی میں بالکل تاب نہیں لا سکتا۔ میں نے اس احمق کی بک بک صرف اس لیے برداشت کی کہ ہر تھوڑے سے وقفے کے بعد، جب اس کا زورِ تکلم ٹوٹتا، میں اس فروخت کے حوالے سے، جس پر میں نے اتنا زیادہ تکیہ کر رکھا تھا، کوئی نہ کوئی سوال کر لیتا۔ اس کاوش میں مجھے اپنے راستے سے ہٹنا پڑا مگر میں اس سے چمٹا ہی رہا۔ تونصلات خانے پر واقع اسٹاک ایکسچینج کے ساتھ پیدل چلنے والوں کے لیے بنے بغلی راستے پر چلتے چلتے ہم ایک چھوٹی گلی میں مڑ گئے جو زقاق صغیر سے جا ملتی تھی اور آخر کار اس گلی کے بیچ میں پہنچتے پہنچتے میں نے وہ تمام معلومات حاصل کر لی جس کی مجھے ضرورت تھی۔ ادھر وکیل کو بھی نزدیک کہیں رہنے والے کسی موکل سے ملنا یاد آ گیا اور اس نے رخصت چاہی۔ میں لمحہ بھر رک کر اسے واپس جاتے دیکھتا رہا اور میں نے اس کی یاوہ گوئی کو کوسا جس کی وجہ سے اس قدر تیز دھوپ اور گرمی میں مجھے بھٹک کر ادھر آنا پڑا تھا۔

''میں کیفے پارادیسو جانے کے لیے مڑا ہی چاہتا تھا کہ یکا یک مجھے یہ عجیب سا لگا کہ میں زقاق صغیر آ نکلا ہوں۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ کیوں، اور پھر مجھے اپنا خواب یاد آ گیا۔ 'اسی جگہ کو تو خزانے کے نامی گرامی مالک نے ہماری وعدہ گاہ قرار دیا تھا؛' میں نے سوچا، مسکرایا اور ارادے کے بغیر سر گھما کر اس طرف نظر ڈالی جدھر لوہاروں کی ہٹیاں تھیں۔

''ارے غضب! وہاں پر واقعی ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ تھا اور وہ بھی سچ مچ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر پہلا اثر تو یہ ہوا کہ مجھے چکر آنے لگا۔ لگتا تھا جیسے میں دھڑام سے گرا ہی چاہتا ہوں۔ میں نے ایک بساطی کے کھوکھے سے ٹیک لگا کر دوبارہ نظر ڈالی۔ وہی کالے کپڑے، وہی تنکوں کا ٹوپ، وہی خدوخال، وہی تیور۔ اور وہ آنکھیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے اعصاب اس طرح کھچ گئے جیسے کسی نے رگ و پے میں پگھلا ہوا لوہا انڈیل دیا ہو۔ خیال تو کرو، عین دوپہر کا عمل، لوگ باگ لاتعلقی کے عالم میں یوں آ جا رہے تھے جیسے انھیں احساس ہی نہ ہو کہ کوئی غیر معمولی بات ہو رہی ہے؛ جب کہ مجھے، صرف مجھے معلوم تھا کہ صورتِ حال انتہائی دہشت ناک ہو چکی ہے اور یہ کہ سامنے ایک پریت بیٹھا ہے جو نہ جانے کن قوتوں کا حامل ہے اور خدا جانے عالمِ بالا کے کس کھونٹ سے، کون سے سقر سے، کس اندھے پاتال سے وارد ہوا ہے۔ یہ سوچ کر میرے ہاتھوں پیروں میں دم نہ رہا۔ مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پریت ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ اب مجھے اس ہول نے آ لیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اٹھ کر میرے پاس چلا آئے، مجھ سے بات کرے، مجھے ساتھ ہی لے جائے! اگر نوبت یہاں تک پہنچی تو پھر انسانی کس بل کا کیا پیش چلے گا؟ میں چھلانگ مار کر ایک کرایہ گاڑی میں سوار ہو گیا اور کوچوان کو بہت دور کا کوئی پتا بتایا، اب یاد نہیں کہاں کا۔

''جب میرے حواس کچھ مجتمع ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ہم سیدی جابر پہنچنے ہی والے ہیں۔ اب، ذرا کل پڑنے کے بعد، میں نے اس معاملے پر غور و خوض شروع کیا۔ کوچوان کو شہر واپس چلنے کا حکم دیا۔ میں سوچ رہا تھا: 'میرا دماغ چل گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مجھے دھوکا ہوا۔ خواب میں نظر آنے والے شخص سے مشابہت رکھنے والا یہ آدمی کوئی اور ہوگا۔ اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لیے مجھے واپس جانا چاہیے۔ احتمال کلی طور پر یہی ہے کہ اب تک وہ جا چکا ہوگا جس سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ وہ کوئی اور تھا، کیوں کہ خواب میں دکھائی دینے والے نے تو چار بجے تک انتظار کرنے کا کہا تھا۔'

''یہی سوچتا بچارتا میں زی زی نیا تھیٹر تک جا پہنچا اور وہاں میں نے اپنے پورے حوصلے کو بروے کار لا کر کوچوان سے کہا کہ وہ مجھے زقاق صغیر لے چلے۔ جب ہم کیفے کی طرف بڑھے تو میرا دل دھک دھک کر رہا تھا بلکہ لگتا تھا کہ پاش پاش ہونے کو ہے۔ کیفے سے تھوڑی دور پر گاڑی رکوانے کے لیے میں نے کوچوان کی بانہہ اس زور سے کھینچی کہ وہ اپنی نشست سے گرتے گرتے بچا۔ وجہ یہ تھی کہ ہم کیفے کے بہت نزدیک، ضرورت سے زیادہ نزدیک، آ پہنچے تھے؛ اور اس لیے بھی کہ وہ آسیب بدستور وہاں بیٹھا تھا۔

''اب میں نے، اس توقع پر کہ شاید اس کے حلیے اور خواب میں آنے والے آدمی کے حلیے میں کوئی فرق نظر آ جائے، اس کا بغور جائزہ لینے پر خود کو آمادہ کیا، حالاں کہ یہ جاننے کے لیے کہ وہ کون ہے اس کے سوا اور ثبوت ہی کیا درکار تھا کہ میں گاڑی میں بیٹھا بیٹھا اسے ایسے چبھتے ہوئے انداز میں گھور رہا تھا کہ کوئی اور ہوتا تو میری حرکت کو اولو قرار دے کر مجھ سے وضاحت طلب کیے بغیر نہ رہتا۔ برا ماننا کجا، اس نے بھی جواباً مجھے اتنے ہی چبھتے ہوئے انداز میں گھورا۔ اس کے چہرے کی کیفیت سے عیاں تھا کہ وہ اس فیصلے کے بارے میں فکرمند ہے جو مجھے کرنا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ میرے خیالات اسی طرح پڑھ رہا ہے جس طرح اس نے انھیں خواب میں پڑھ لیا تھا۔ اس غرض سے کہ مجھے اس کی شناخت کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے، اس نے اپنا بایاں ہاتھ میری طرف کر کے وہ زمردیں انگوٹھی، جو مجھے پہلے خواب میں اتنی کھٹکی تھی، بے محابا انداز میں دکھائی اور میں ڈرا کہ یہ حرکت کہیں کوچوان کو بھی متوجہ نہ کر لے۔

''دہشت کے مارے میری چیخ نکل گئی اور میں نے کوچوان سے کہا، جسے اب اپنی سواری کی صحت کے بارے میں تشویش لاحق ہو چکی تھی، کہ مجھے رملہ بولیوار لے چلو۔ میرے سامنے ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ بہت دور نکل جاؤں۔ رملہ بولیوار پہنچ کر میں نے اسے سان استیفانو کا رخ کرنے کو کہا لیکن جب دیکھا کہ وہ ہچکچا اور منھ ہی منھ میں بڑبڑا رہا ہے تو میں اتر پڑا اور اس کا حساب چکا دیا۔ میں نے ایک اور گاڑی روکی اور کہا کہ مجھے سان استیفانو پہنچایا جائے۔

''میں بالکل آشفتہ حال وہاں پہنچا۔ کسینو کے بڑے کمرے میں داخل ہوتے ہی آئینے میں اپنے

چہرے پر نظر پڑی، جو لاش کی طرح زرد تھا، تو سہم کر رہ گیا۔ خوش قسمتی سے کمرہ خالی پڑا تھا۔ ایک تخت نما صوفے پر جا پڑنے کے بعد میں نے سوچنا چاہا کہ اگلا قدم کیا اٹھایا جائے۔ گھر واپس جانا تو ناممکن تھا۔ اس کمرے میں دوبارہ قدم رکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا جس کے آر پار وہ رات کے وقت، کسی مافوق الفطرت سائے کی طرح، کھسکتا چلا آیا تھا، وہی جسے میں نے ابھی ابھی عام آدمی کا روپ دھارے ایک عام سے کیفے میں بیٹھے دیکھا تھا۔ میرے استدلال میں کوئی وزن نہ تھا کیوں کہ ظاہر ہے کہ میں کرۂ ارض پر کہیں بھی چلا جاتا وہ میرا کھوج لگا لینے کی قدرت رکھتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے میرے خیالات میں بے ربطی نمایاں ہو چکی تھی۔

''بالآخر میں نے طے کیا کہ محرم بے جا کر اپنے دوست جی وی کو تلاش کرتا ہوں۔''

''کون سا جی وی؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ خبطی تو نہیں جو اپنا وقت سحر و ساحری کے مطالعے میں گزارا کرتا تھا؟''

''وہی — اور میں نے اسے چنا بھی کچھ اسی لیے کہ وہ سحر و ساحری کا مطالعہ کرتا تھا۔ میں ٹرین پر کیسے سوار ہوا، اس ڈر کے مارے کہ وہ پریت کہیں دوبارہ میرے پہلو میں نمودار نہ ہو جائے، کسی جنونی کی طرح دائیں بائیں گھورتا ہوا، محرم بے کیسے پہنچا، جی وی کے کمرے میں کیسے داخل ہوا، یہ سب باتیں گڈمڈ حالت میں مجھے دھندلی دھندلی یاد ہیں۔ بس ایک ہی یاد بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اس کے پاس پہنچ کر جب میں نے اپنا ہول ناک تجربہ گوش گزار کرنا شروع کیا تو دیوانہ وار رو رہا تھا اور مجھ پر سر سے پاؤں تک کپکپی طاری تھی۔ جی وی نے مجھے تسلی دی اور نیم سنجیدہ اور نیم مزاحیہ انداز میں کہا کہ رونے کی ضرورت نہیں اور یہ کہ پریت کو کبھی اس کے گھر میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوگی اور اگر وہ آیا بھی تو فوراً اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے گا۔ کہنے لگا کہ وہ اس قسم کے مافوق الفطرت پر چھاووں سے خوب واقف ہے اور انھیں بھگانے کا طریقہ بھی جانتا ہے۔ اس نے بمنّت یہ یقین بھی دلایا کہ اب اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ پریت ایک خاص مقصد سے میرے پاس آیا تھا۔ وہ لوہے کی صندوقچی کا طلب گار تھا جسے بظاہر کسی آدم زاد کی موجودگی اور مدد کے بغیر حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اس کی تدبیر ناکام ہو گئی تھی۔ وہ میری دہشت زدگی دیکھ کر سمجھ گیا ہوگا کہ کامیابی کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ بلاشبہ وہ اب کسی اور کو پھسلانے کی کوشش کرے گا۔ جی وی کو صرف یہ افسوس تھا کہ میں نے اس سے بروقت رابطہ کیوں نہ قائم کیا تاکہ وہ جا کے پریت سے ملتا اور بات چیت کرتا کیوں کہ، اس نے وضاحت کی، آسیبوں کی تاریخ میں ان ارواح یا شیاطین کی دن دہاڑے موجودگی انتہائی غیر معمولی ہے۔ ان باتوں سے میرا اطمینان نہ ہوا۔ میں ساری رات بہت بے چین رہا اور صبح جاگا تو مجھے بخار چڑھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی جہالت اور میرے اعصابی نظام کی برانگیختگی کی وجہ سے سرسام

ہوگیا، اور میں مرتے مرتے بچا۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو میں نے پوچھا کیا دن ہے۔ میں اگست کی تین تاریخ کو بیمار پڑا تھا اور یہی سمجھ رہا تھا کہ اگست کی سات یا آٹھ تاریخ ہوگی۔ ستمبر کی دو تاریخ تھی۔

''بحرائیگا یوس کے ایک جزیرے جا کر تھوڑی مدت قیام کرنے سے میں نہ صرف زیادہ جلد بلکہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا۔ میں نے علالت کی پوری مدت جی وی کے ہاں گزاری۔ جیسا کہ تم دونوں جانتے ہو، وہ ہمدرد آدمی ہے۔ اس نے بڑی شفقت سے میری تیمار داری کی۔ وہ اس بات پر خود سے بہت خفا تھا کہ اس نے جرأت کردار کا مظاہرہ کر کے ڈاکٹر کو چلتا کیوں نہ کر دیا اور میرا علاج صرف جادو سے کیوں نہ کیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ، کم از کم اس معاملے میں، جادو کی مدد سے بھی میں بہر طور اتنی ہی جلد تندرست ہو جاتا جتنا وقت ڈاکٹر کے علاج نے لیا تھا۔

''تو یہ بات تھی، دوستو! لاکھوں میں کھیلنے کا ایک موقع مجھے ملا۔ بس میں ہمت نہ دکھا سکا۔ میں ہمت نہ دکھا سکا اور مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔''

اتنا کہہ کر الیگزینڈر خاموش ہوگیا۔ اس کے بیانیے کے مکمل تیقن اور سادگی نے رائے زنی کی کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی۔ ہم کہتے بھی تو کیا کہتے۔ علاوہ ازیں، اب رات کے بارہ بج کر ستائیس منٹ ہو چکے تھے۔ اور شہر کے لیے آخری ٹرین چوں کہ ساڑھے بارہ بجے چھوٹتی تھی اس لیے ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ شب بخیر کہیں اور بھاگم بھاگ چل دیں۔

لیون ہارڈ فرانک

کارل اور اینا

دھرتی کے دور دراز خم کے اوپر، جہاں لق و دق میدان کا افق واقع تھا اور جہاں یورپ اور ایشیا کی سرحدیں ملتی تھیں، ایک نقطہ جو کسی چہچہانے والی چڑیا سے بھی چھوٹا تھا، نمودار ہوا؛ اور گو وہ تقریباً سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے دونوں آدمیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، زمین اور آسمان اتنے بے پناہ طور پر وسیع تھے کہ وہ نیلے فاصلے میں ایک ہی مقام پر بے حرکت معلق نظر آتا تھا۔

اس رفتار کے باوجود پندرہ منٹ گزر گئے تب کہیں یہ پتا چلا کہ وہ ایک ہوائی جہاز ہے؛ اور گو وہ یکساں بلندی پر پرواز کر رہا تھا، معلوم یہی ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑی قوس بناتا ہوا آسمان میں چڑھتا جا رہا ہے۔

ان دو آدمیوں کے عین اوپر کی جھلملاتی ہوئی فضا میں پہنچ کر ہوا باز نے اپنے نیچے لق و دق میدان میں ایک دیو پیکر صلیب دیکھی جو کئی میل لمبی اور چوڑی تھی: ایک سیدھی اور ایک اریب خندق جنھیں دونوں آدمیوں نے میدان کی کالی مٹی کھود کر بنایا تھا۔

ہوا باز کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سنسان غیر آباد میدان میں اس صلیب نما خندق کا کیا مقصد ہے۔ وہ، اول تا آخر یکساں بلندی پر اڑتا ہوا، مغرب کی طرف بڑھتا گیا، لیکن اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوائی جہاز ایک بہت بڑی قوس بناتا ہوا، زمین کی طرف اتر رہا ہے۔ پندرہ منٹ بعد وہ، چھوٹا ہوتے ہوتے دوبارہ کسی ننھی منی چڑیا سے مشابہ ہو کر، میدان کے افق کی اوٹ میں چھپ گیا۔

دونوں آدمی اس عظیم تنہائی میں دوبارہ اکیلے رہ گئے۔

خود انھیں بھی اس چلیپائی خندق کا مقصد معلوم نہ تھا۔ وہ صرف اتنا قیاس کر سکتے تھے کہ کئی سال پہلے ایک ڈیم کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا تھا تاکہ بوقت ضرورت دشمن افواج کی پیش قدمی روکنے کے لیے میدان میں طغیانی لائی جا سکے۔

جنگ چھڑتے ہی قید ہو جانے کے فوراً بعد انھیں راشن، جو ماہ بہ ماہ ملتا رہتا تھا، اور نالی دار لوہے کا بنا ہوا ایک سفری سائبان دے کر یہاں بھیج دیا گیا تھا؛ اور چار گرمیاں وہ پہرے داروں اور نگرانی کے بغیر کھدائی میں مصروف رہے تھے۔ وہ اکثر اور دیر دیر تک ستایا کرتے؛ کبھی کبھی وہ آدھا دن میدان کی گھاس پر سو کر گزار دیتے لیکن بالآخر وہ دوبارہ کھدائی شروع کر دیتے کیوں کہ آدمی کچھ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

چڑیاں، دانے دنکے کی تلاش میں، مسلسل ادھر ادھر اڑتی پھر رہی تھیں اور ٹڈوں کے ہزاروں آوازوں پر مشتمل تیز اور مدھم ہوتے کورس میں گہری خاموشی پنہاں تھی، جیسے زمین زندگی کے نصف النہار پر پہنچ چکی ہو، اور منتظر اور گوش بر آواز ہو۔

کدال نے ایک کیڑے کے دو ٹکڑے کر دیے۔ آدمی نے ایک ٹکڑے کو زمین میں سے کھینچ کر اوپر اچھال دیا۔ ایک چڑیا نے اسے ہوا ہی میں پکڑ لیا۔

''میں ہمیشہ پلنگ کے اُس حصے پر سویا کرتا تھا جو دیوار کے ساتھ تھا، اور وہ کھلی طرف؛ اور جب وہ صبح سویرے اٹھتی تھی تو آہٹ تک نہ ہوتی تھی۔ وہ بہت ہی چپ چاپ تھی، سمجھے بھئی؟ — ہمیشہ اتنی چپ چاپ۔''

''یہ تم نے مجھے پہلے بھی بتایا تھا۔ تم اٹھتے ہی نہ تھے جب تک گیس کے چولھے کی ٹونٹی سوں سوں نہ کرنے لگتی تھی۔''

''ٹھیک ہے؛ ہمیشہ ایک ہی سی آواز میں۔ میں اٹھ کر اکثر اسے ٹھیک کیا کرتا تھا۔ لیکن پھر مجھے لام پر جانا پڑا۔'' شادی شدہ آدمی بیلچہ چلاتا رہا۔ اس نے اپنی داڑھی بڑھ جانے دی تھی اور میلا کچیلا سا نظر آ رہا تھا۔

اس کا ساتھی قریب لیٹا تھا۔ وہ پہلے گھاس کی ایک اور پھر دوسری پتی چباتا رہا۔ ''میں حیران ہوں کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کا سینہ اتنا گورا ہے اور اس کے کولھے اور باقی بدن اتنا زیادہ سانولا؟'' اور جب شادی شدہ آدمی نے کوئی جواب نہ دیا: ''جیسے کانسی، تم کہتے ہو؟''

''جب وہ تمھارے بس میں ہوتی ہے تو تمھارا ذہن بالکل مٹ جاتا ہے۔''

آدھ گھنٹے بعد — اور اس اثنا میں متعدد بار، کسی سمجھ میں آنے والی وجہ کے بغیر، چڑیوں کا جھلڑ گنجان ڈھیر کی شکل میں اڑا، اور میدان میں پرے جا کر اترا، اور پھر دوبارہ غول در غول واپس آ گیا — اس نے مزید کہا، ''لیکن اس بات کو عنقریب چار سال ہو جائیں گے۔ بعض دفعہ مجھے یہ بھی یاد نہیں آتا کہ اس کا حلیہ کیا تھا۔ میں اس کا حلیہ نہیں دیکھ سکتا، اسے ذہن میں حاضر نہیں کر سکتا۔ تم جانتے ہو، کارل، سب کچھ دھندلا سا جاتا ہے۔ لیکن جب میں اسے خواب میں دیکھتا ہوں تو وہ اتنی جیتی جاگتی معلوم ہوتی ہے کہ میں

اسے چھو سکتا ہوں۔"

"مجھے ٹھیک پتا ہے کہ وہ کیسی ہے... اور اس کے طور طریق کیا ہیں۔ میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔"

"مگر تم نے تو اسے کبھی دیکھا تک نہیں... اگر میں اس ہوائی جہاز میں ہوتا تو جلد ہی اس کے پاس پہنچ جاتا، وہ اتنی دور سہی... خدایا، یہ کون برداشت کر سکتا ہے! چار سال!"

"کچھ بھی ہو، دنیا میں تمھارا کوئی ہے تو سہی جو تمھارے متعلق سوچتا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔"

"کوئی، جو وہاں ہے، جو تمھارا منتظر ہے۔ لیکن میں — جب میں اس بارے میں غور کرتا ہوں — تو میرے لیے وہاں کچھ بھی نہیں۔"

"ہاں وہ منتظر ہے۔ بشرطیکہ وہ ابھی زندہ ہو۔"

"وہ ابھی زندہ ہے،" دوسرا جلدی سے چیخا؛ اور خود دوبارہ زمین پر لیٹ گیا اور لق و دق میدان کے اس پار دیکھنے لگا۔ اس نے چشم تصور میں اس عورت کو دیکھا جسے کبھی نہ دیکھا تھا؛ اس عورت کو اس چھوٹے سے کمرے میں، جہاں خود اس نے کبھی قدم بھی نہ رکھا تھا، درازوں کی پٹی جھاڑتے پونچھتے دیکھا، کمرے کی دوسری طرف صوفے کے پاس جا کر صوفہ پوش کی سلوٹیں نکالتے دیکھا۔ وہ صوفے پر جھک گئی۔ اسے پتا تھا کہ صوفہ کمرے میں ٹیڑھا رکھا ہوا ہے اور وہ صوفہ پوش کے رنگ اور بیل بوٹوں کے نمونے سے بھی آشنا تھا۔

"رچرڈ! میں نے کہا، رچرڈ، اگر وہ اس وقت یہاں ہو، تمھاری بیوی، تو تم مجھے اس کے ساتھ سونے دو گے، صرف ایک دفعہ؟"

شادی شدہ مرد نے دونوں ہاتھ بیلچے کے دستے پر رکھے اور اپنی ٹھوڑی ہاتھوں پر ٹکا دی۔ "اگر وہ اس وقت یہاں ہو —" یہ بات اس کے تصور میں نہ آ سکی۔

"بتاؤ۔"

وہ دیر تک اس آدمی کو تکتا رہا جو قریب لیٹا ہوا تھا۔ "میں شاید... کیوں کہ تم بھی اسی دوزخی وبال میں گرفتار ہو جس میں مَیں پھنسا ہوا ہوں... ایک دفعہ... شاید... لیکن تم نے اگر دوبارہ کوشش کی تو میں کدال سے تمھارا سر پھاڑ دوں گا۔"

"جانے وہ گیس کی ٹونٹی اب بھی سوں سوں کرتی ہے کیا؟"

ایک بادل کا سایہ پھیلا۔ ٹڈوں کا راگ میدان میں دور ہٹتے ہٹتے ختم ہو گیا۔ بالکل قریب سے ایک واحد مختصر چیں چیں سنائی دی۔ آخری ٹڈا خاموش ہو گیا۔ مکمل سکوت میں ان آدمیوں کو اچانک اپنے خون کی

گردش کا احساس ہوا۔ فاصلے پر، جہاں دھوپ ابھی موجود تھی، میدان کے قطعات چمکیلے سونے کی طرح لہک اٹھے تھے۔

بادل کا سایہ پھیکا پڑا اور خیرہ کن دھوپ میں معدوم ہوگیا۔ موسم گرما کا کورس اپنی ہزاراں ہزار آوازوں کے ساتھ افق تا بہ افق لہریں لیتا ہوا پھر سے شروع ہوگیا۔ گھاس کی کوئی پتی تک نہ ہل رہی تھی۔

''لیکن اینا اس پر کبھی راضی نہ ہوگی۔ وہ دوسرے مردوں کے لیے نہیں ہے... میں نے تمھیں بتایا تو تھا کہ ہماری پہلی رات کو کیا پیش آیا تھا۔ میں عاجز آ گیا تھا۔ اس وقت وہ تیئیس برس کی ہوئی تھی — لیکن یہ سب باتیں میں تمھیں پہلے بتا چکا ہوں۔ لہٰذا تم خود ہی فیصلہ کرلو، کارل۔''

ان چار طویل گرمیوں کے دوران میں، جب وہ اپنی حسرتوں سمیت اکیلا تھا، اس نے اپنے ساتھی کو ایک ایک بات بتادی تھی؛ اور اس کے باوجود بالطبع وہ خاموش آدمی تھا۔ پیٹ بھر کر کھانے اور سر چھپانے کی جگہ بنائے رکھنے کے لیے روزانہ کی وہ جدوجہد — یاد آنے پر ماضی کی وہ آزمائشیں تک اب دلکش معلوم ہوتی تھیں کیوں کہ اب وہ تنہائی اور حال کی آزمائش سے دوچار تھا۔

اس کی تنہائی کے ساتھی کارل کو پتا تھا کہ گدّے کے تین حصے تھے، اور اینا کے کولھے دیکھنے میں خوب نمایاں اور نشیب و فراز سے مملو تھے؛ اور اینا کے جذبات کو برانگیختہ ہونے سے پہلے ہمیشہ حجاب کا پردہ چاک کرنا پڑتا تھا، اور یہ کہ اس کے بعد وہ بہت گرم جوشی کا ثبوت دیتی تھی، لیکن اَور لحاظ سے بہت خاموش، ہنرمند اور صاف ستھری عورت تھی۔ کارل کو پتا تھا کہ راکھ کریدنی کا دستہ پیتل کا ہے اور اینا کے تین چھوٹے چھوٹے تل ہیں، ساٹن کی طرح بھورے۔ اسے پتا تھا کہ اسٹوو اور راکھ کریدنی کہاں رکھی ہے اور اسے پتا تھا کہ تینوں تل کہاں ہیں۔ چوں کہ دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا، اینا کی تصویر اس کے اندر اُبھر آئی تھی۔

''لیکن فرض کرو کہ جتنے عرصے تم اس سے جدا رہے ہو اس نے بے وفائی کا ثبوت دیا ہو اور کسی اَور کو اپنا بنالیا ہو۔ ایک ایسی عورت کے لیے جس کی رگوں میں خون ہو، چار سال کا عرصہ بڑا طویل ہے، رچرڈ... اگر یہاں گھاس میں ٹڈوں کی جگہ عورتیں ہوں تو شاید تم بھی زیادہ تامل سے کام نہ لو۔''

''لو سنو، اور میں تمھیں ایسی بات بتاتا ہوں جو شاید تمھارے علم میں نہ ہو۔ جب اینا اور میں شہر میں آکر آباد ہوے تو ہم نے ایک چھوٹا سا عمدہ کمرہ کسی طرح سے ہتھیالیا اور قسطوں پر سامان خرید کر اسے فوراً آراستہ کرلیا۔ ایک ہفتے بعد مجھے لام پر بلالیا گیا۔''

''مجھے اس بارے میں سب پتا ہے۔ چھ مارک کی ماہوار قسطیں۔''

''لیکن جب ہمیں ابھی یہ پتا نہیں چلا تھا کہ مجھے جانا پڑے گا تو ہم نے آپس میں کہا تھا: اب ہمیں بس اپنے گھر سے چمٹے رہنا چاہیے اور ہماری اچھی گزر جائے گی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اینا یہ بات بھولی نہ

ہوگی۔ ان دوسرے خیالات میں پڑنے کی اسے فرصت ہی کہاں ہوگی۔ اس کے لیے تو گھر کو سنبھالے رکھنا ہی خاصا مشکل ثابت ہوا ہوگا۔"

"شاید بالکل اسی وجہ سے وہ —"

"تمھیں اس سے کیا سروکار؟ تم زبان درازی سے تو باز رہ سکتے ہو، کم از کم۔ اور جہاں تک اینا کا تعلق ہے، میں — لیکن مجھے پتا ہے وہ ایسی حرکت نہیں کرے گی!" اس نے کدال کو سر سے بلند کیا اور اس زور سے گھما کر نیچے لایا کہ زناٹے کی آواز بلند ہوئی۔

آرزو اور بے بسی نے اکثر اسے بے مصرف صلیب کی توسیع کرتے رہنے پر مجبور کردیا تھا؛ اور اب وہ محنت شاقہ سے اپنے شکوک کچل دینے میں کامیاب ہوگیا۔

جب کارل دو برس کا تھا تو اس نے اپنی ماں کی ٹوپی سے ایک کھلونا گاڑی بنائی تھی۔ اس میں لمبے لمبے ربن تھے اور ربنوں کے درمیان گھوڑے کی جگہ وہ خود جت گیا تھا اور نئی ٹوپی کو صحن میں بارش کے پانی کے تھالوں میں گھسیٹے گھسیٹے پھرتا رہا تھا۔ اس کے بعد سے تخیل کی نعمت اسے لطف سے زیادہ اذیت پہنچاتی رہی تھی۔ وہ جہاں تھا وہیں، خیالوں کا ظلم سہتا ہوا، بے حس و حرکت لیٹا رہا، یہاں تک کہ سورج ڈوب چلا اور اس کے ساتھی کی اٹھی ہوئی کدال ایک دیو قامت سایہ ڈالنے لگی۔

مغربی افق پر غروب آفتاب کی آگیں دہک رہی تھیں۔ سرخ ہوتا ہوا سنہرا بھاری پہیہ ابھی کنارے نہیں لگا تھا۔ دونوں آدمیوں کے آس پاس اب گھاس کی پتیوں کے نوکیلے سرے دھوپ سے سنہرے تھے۔ ذرا اور پرے، میدان کا رنگ گہرا سیاہی مائل سبز ہو چکا تھا اور دور افتادہ مشرقی افق پر رات ابھی سے چھائی جارہی تھی۔ ٹڈے دیوانہ وار بول رہے تھے۔ گرمی میں نمی کی بو تھی۔

اس لوہار کی طرح جو، دن کا کام ختم ہوجانے پر، اپنی میز کو آنے والے دن کے لیے صاف کردیتا ہے، رچرڈ نے کوٹ پہننے سے پہلے بیلچہ لے کر کھدی ہوئی مٹی خندق سے نکال دی۔

جب انھیں چلتے چلتے پندرہ منٹ ہوگئے تو ان کے بوٹ نمی کی وجہ سے پچ پچ کرنے لگے۔ آسمان پیلا ہوگیا تھا۔ خاکستری بے کرانی میں نالی دار لوہے کا سائبان اجاڑ کھڑا تھا۔

اگلی صبح وہ اپنا راشن لینے قیدیوں کے کیمپ روانہ ہوئے۔ مسلسل چار گرمیاں انھوں نے ہر مہینے ایک دفعہ یہ سفر کیا تھا۔ ایک دن جانے میں لگتا اور ایک آنے میں، اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے چلا کرتے تھے۔ ان کے گزرنے کے بعد دبی ہوئی گھاس ہمیشہ پھر کھڑی ہوجاتی تھی۔ قدموں کی صرف ایسی لیک باقی رہ جاتی تھی جو مشکل ہی سے شناخت میں آسکتی تھی۔

یہ ماہر فن، کارل اور رچرڈ، دونوں برابر قد کے تھے اور دونوں کی رنگت دھات کا کام کرنے والوں

کی طرح سانولی تھی۔

پڑاؤ میں قیدیوں کا ایک جتھا کوچ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ''تعداد پوری کرنے کے لیے ہم ان دونوں میں سے ایک کو لے چلیں گے،'' پہرے دار نے کہا اور رچرڈ کا نام پکارا۔

پانچ منٹ بعد — اسے کارل سے رخصت ہونے کی مہلت نہ ملی تھی — رچرڈ نے خود کو دوسروں کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن کی طرف کوچ کرتے پایا، جہاں سے پوری کمپنی کو مشرق میں اور آگے ایسی جگہ بھیج دیا گیا جو کئی دن کے سفر کے بعد آتی تھی۔

۲

رچرڈ کی روانگی کے اگلے دن کارل کیمپ سے فرار ہوگیا۔ اینا کی طلب نے اسے اس سفر پر روانہ ہونے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

اس نے جی میں ٹھان لی تھی کہ وہ کمرے میں اینا کے پاس چلا جائے گا، اس کی خیر سلا اس طرح پوچھے گا جیسے وہ اس کی بیوی ہو، یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ اس کا شوہر ہے، کہ وہ رچرڈ ہے؛ اور اس نے یہ طرزِ عمل اختیار کرنے کا تہیہ اس لیے کیا تھا کہ اسے اندیشہ تھا کہ بصورت دیگر وہ شاید اینا کو ہمیشہ کے لیے اپنی نہ بنا سکے۔ ساز باز میں اس کی دل بستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس کا تمام جسم، جبلّی بے صبری کے ساتھ، کسی ایسی ہستی کا طلبگار تھا وہ جس کے لیے اور جو اس کے لیے زندگی بن جائے۔

یہ کہ وہ رچرڈ کا ہم پیشہ تھا، اس کی کاٹھی بھی اسی جیسی تھی، آنکھوں اور بالوں کا رنگ بھی اسی جیسا تھا، وہی سانولی رنگت تھی جو تمام دھات کا کام کرنے والوں کا خاصہ ہے؛ حتیٰ کہ اس کی بھنویں بھی، رچرڈ ہی کی طرح، خاص طور پر گھنی اور بہت خمیدہ تھیں — ان تمام باتوں پر اس نے توجہ دی تھی تو سرسری۔

اینا نے جو زندگی رچرڈ کے ساتھ گزاری تھی اس کی تمام تفصیلات کارل کو اس قدر محرمانہ طور پر معلوم تھیں جیسے وہ بھی ان کا شریکِ زندگی رہ چکا ہو؛ وہ سراسر اینا کی ذات سے لبریز تھا۔ تصور میں اینا اس کے لیے وہ ٹھکانا بن گئی تھی جسے تمام انسان کسی دوسرے انسان میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔

کیمپ سے فرار ہونے کے تین ماہ بعد کارل اس شہر میں پہنچ گیا جس میں اینا رہتی تھی۔

رات کو جنگلوں میں پیدل چل کر، چھپنے کی ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر، متعدد سرحدیں پار کر کے، تپتی دھوپ میں دریاؤں کے کنارے کنارے پیادہ پا، یہ عظیم فاصلہ طے کرتے وقت اسے ہر لحظہ پکڑے جانے کا دھڑکا لگا ہوا تھا، اور اس تمام عرصے میں وہ شاذ و نادر ہی کسی چھت کے نیچے سویا تھا۔

مضافات کے اولین الگ تھلگ بنے ہوئے مکانوں کے بلاک ٹھنٹھیلے خزانی کھیتوں کے درمیان کالے کالے کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہ شہر سے واقف نہ تھا، لیکن اسے ٹھیک ٹھیک پتا تھا کہ بلڈنگ کیسی ہے اور اسے مکان کا نمبر معلوم تھا۔ اسے راستے کا پتا تھا۔ بلڈنگ زیادہ دور نہ تھی۔

شام کے وقت ایک طوفان بادوباراں نے گھر آنے والے مرد کے چہرے اور جوتوں سے گردوغبار دھو دیا تھا۔

وہ ایک حجام کی دکان میں داخل ہوا اور اپنی چھوٹی سی پوٹلی، جو گیلے اخبار میں لپٹی اور چمڑے کے تسمے سے بندھی ہوئی تھی، ایک سیٹ پر ڈال دی اور اس پر اپنا ہیٹ رکھ دیا۔

حجام نے ہیٹ اٹھا کر کھونٹی پر ٹانگ دیا اور کفِ دست پھیلا کر ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

قید کے دوران میں بھی کارل ہر سنیچر کو داڑھی مونڈتا تھا اور اکثر رچرڈ سے کہا کرتا تھا، ''اگر تم پہلے ہمیشہ شیو بنائے رکھتے تھے، اور اتنے برس بعد داڑھی بڑھا کر گھر پہنچے تو شروع شروع میں اینا تمھیں پہچانے گی بھی نہیں۔''

اس اشتیاق اور مسرت سے معمور جو مرد، طویل مفارقت کے بعد، اپنی پیاری بیوی کے پاس لوٹ آنے پر محسوس کرتا ہے، کارل سڑک پر تیزی سے چلتا ہوا اس بلڈنگ کی طرف گیا جہاں اینا رہتی تھی۔ وہاں سب سے نچلی منزل میں جوتوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔

دکان کی کھڑکی میں پرانے جوتوں کے تین جوڑے اور ایک ٹوٹا ہوا گلدان الٹا پڑا تھا اور ایک بلی سو رہی تھی۔ دکان اس تصور سے بالکل مختلف تھی جو کارل کے ذہن میں تھا۔ رچرڈ کے بیان کے مطابق، چار سال پہلے، کھڑکی میں کم ازکم نئے جوتوں کے دو سو جوڑے سجے ہوئے تھے، ہر جوڑے کے ساتھ ایک چھوٹا نیلا کارڈ تھا جس پر موٹے موٹے اُبھرواں زرد ہندسوں میں قیمت درج تھی اور سب سے پیش پیش، بیچا بیچ رکھی شیشے کے ایک قاب میں خاص طور پر بڑے بڑے لک کے بوٹوں کا جوڑا رکھا تھا جس کا بالائی حصہ تیز زرد رنگ کا تھا اور ایک نمائشی کارڈ پر یہ الفاظ رقم تھے: ''بہت سجیلے۔''

جب اور اب کے درمیان جنگ عظیم حائل ہے، کارل نے سوچا۔ اس نے پیٹ پر تشویش کا دباؤ محسوس کیا، اور اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ اس کی خوشی اور اشتیاق رخصت ہو چکا تھا۔

''دوسرا احاطہ، بائیں ہاتھ کا دروازہ، دوسری منزل اور بائیں طرف سے دوسرا دروازہ۔'' زینہ چڑھتے ہوئے اس نے اسٹینسل شدہ دیواروں پر پڑی ہوئی خراشوں پر توجہ دی۔ اسٹینسل کاری کا نمونہ اسے رچرڈ نے بنا کر دکھایا تھا۔ اس کے پیٹ پر جو دباؤ تھا وہ کم نہ ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوٹ جائے اور پھر کسی وقت آئے۔ آہستہ آہستہ اس نے آخری دو سیڑھیاں چڑھیں، چاروں طرف نظر ڈالی، چند قدم کا باقی فاصلہ

طے کیا اور دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے نام پڑھا۔

چشم تصور میں اس نے اینا کو گیس کے چولھے کے سامنے کھڑے کام کرتے دیکھا، اس کی گردن کا پچھلا حصہ، اس کا ذرا ذرا جھکا سر دیکھا۔ اس نے اسے میز تک جا کر گیس اسٹوو کی طرف لوٹتے دیکھا۔ اس کے اعضا کی حرکات، اس کی ذات کی آسودگی اور گہرائی پر دال تھیں اور موزوں اور مکمل تھیں؛ وہ عمیق طور پر کارل کو جانی پہچانی معلوم ہوتی تھیں۔

کارل کو اینا کی شکل و شباہت کا اتنا صحیح علم حاصل تھا کہ وہ کسی بھری سڑک پر دور سے اس کی یونہی سی جھلک دیکھ کر بھی اسے فی الفور شناخت کر سکتا تھا۔

سخت تشویش سے مغلوب ہو کر اس نے اپنا بڑا اور مضبوط، کاریگروں والا ہاتھ اپنے کالر اور گردن کے درمیان پھیرا۔ یکا یک اس نے خود کو دوبارہ سیڑھیاں اترتے دیکھا۔

پھر وہ دستک دے کر دروازہ کھول بھی چکا تھا۔

"...اینا!"

وہ کھڑکی سے ہٹ کر کمرے کے بیچ میں آ گئی اور اس نے میز پر سے ایک رکابی اٹھالی۔

اور کارل پر انکشاف ہوا کہ تخیل کی کھینچی ہوئی تصویر انتہائی ولولہ انگیز کیوں نہ ہو، ایک جیتی جاگتی ہستی کی سانس لیتی، ہر سانچے میں ڈھل جانے والی حقیقت اس سے کہیں بڑھ کر ہے، کہ اس کے بدلتے ہوئے خدوخال خون کے ذریعے زندگی سے وابستہ ہیں اور خود زندگی ہیں؛ اس کی شکل اپنے پس منظر سے الگ نظر آتی ہے، اس کی حرکات گردوپیش کی فضا میں کھبی جاتی ہیں۔

کارل کی جلد پر کپکپی دوڑ گئی۔ اس کی خوشی اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑی۔ "اینا! اینا! تم نے مجھے پہچانا؟" یہ جھوٹ نہیں تھا۔

اس کی خوشی دیکھ کر اینا کا خوف دور ہو گیا۔ اطمینان کے احساس کے ساتھ اس نے بے تکلفی سے اور متجسس ہو کر دریافت کیا: "تم کون ہو؟"

اینا نے موٹے سوتی کپڑے کی دھلی دھلائی نیلی فراک پہن رکھی تھی جس کا رنگ اس کے کولھوں اور اٹھی ہوئی چھاتیوں پر سے دھوپ کی وجہ سے کچھ اڑ سا گیا تھا۔ اس کا سیدھا سادہ، مضبوطی سے سانچے میں ڈھلا ہوا چہرہ ایسا تھا کہ فطرت شاید اس سے ان عورتوں کے لیے نمونے کا کام لے سکتی جو توانائی اور گرمی کی حامل اور سلیم الطبع ہوں۔

حجام کی دکان کی طرح یہاں بھی کارل نے اپنی پوٹلی گھسی پٹی کرسی پر اور ہیٹ پوٹلی پر رکھ دیا۔ "مجھے ان کرسیوں کو ضرور صاف کر کے دوبارہ رنگنا چاہیے۔ جب ہم نے انھیں خریدا تھا تو میں نے تمھیں بتایا تھا

کہ یہ رنگ پائیدار ثابت نہ ہوگا۔"

اینا کو فوراً یاد آ گیا کہ یہ بات اس کے شوہر نے کہی تھی۔ اس پر بوکھلاہٹ غالب آ گئی۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں پھر؟"

"تم کون ہو؟"

کارل کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا، ہونٹوں کا بھی۔ "رچرڈ۔"

وہ ایک ہاتھ سے میز پر جھکے جھکے پیچھے ہٹ گئی۔ "میرے شوہر؟... تم میرے شوہر نہیں ہو۔"

"اینا!" یکایک جوش کے مارے اس کے گھٹنوں میں دم نہ رہا۔ وہ دو قدم چلا اور بیٹھ گیا۔ "اینا!"

اس کے لہجے نے اینا کو متاثر کیا۔ جس طرح کہ عورت اس وقت بھی روز مرہ کے چھوٹے موٹے کام کاج کرتی رہتی ہے جب قسمت نے اسے اپنے سب سے سنگین ظلم کا نشانہ بنایا ہو، اسی طرح اینا گیس کے چولھے کے پاس گئی، نمک دان اٹھا کر اپنی جگہ رکھا، تینوں جلی ہوئی تیلیاں یکجا کیں اور چند لمحے، سر جھکائے، بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

کارل نے تھوڑی دیر پہلے، چشم تصور میں اسے جس طرح کھڑے دیکھا تھا وہ اب عین مین اسی طرح کھڑی تھی۔

وہ یوں پلٹی جیسے کسی اور کمرے میں گئی ہوئی تھی اور بس ابھی باورچی خانے میں واپس آئی ہے۔ اس کی دودھیا کنپٹیوں پر لال لال چتیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔

طبیعت کی وہ اتنی سادہ اور بے ریا تھی کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اسی لہجے میں بات کرنے والے آدمی پر بالکل یقین نہ کرنے سے منکر تھی۔ وہ اس عورت کی طرح کارل کو دیکھتی رہی جو بے طرح پس رہی ہو مگر اپنا بچاؤ نہ کر سکتی ہو۔

"کیوں؟" اس نے کہا۔ "ارے، اینا تمھیں مجھ پر یقین نہیں آ رہا؟... تمھارے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں۔" زندگی کی گرم گرم دھار اس کی مسکراہٹ میں کھنچ آئی، اور زندگی کی ساری بدنصیبی اور ساری شادمانی اس میں موجود تھی اور جب اس نے یہ کہا کہ "تم میری بیوی ہو،" تو اس کے نزدیک جھوٹ سچ میں تبدیل ہو گیا۔

اینا جانتی تھی کہ وہ سچ نہیں بول رہا، اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے الفاظ میں جذبے کے خلوص کو بھی محسوس کر رہی تھی۔ وہ پیٹ پر ہاتھ باندھے کھڑی اس بات سے بوکھلا رہی تھی کہ وہ اجنبی مرد، جو کرسی پر آگے کو جھکا ہوا بیٹھا تھا، خود اس کے احساس کو جملہ طور پر بیگانہ محسوس نہ ہو رہا تھا۔

وہ برتنوں کی الماری کی طرف بڑھی۔ "خدایا! تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟"

اس نے ایک خانے کی تلاشی لی اور ایک پوسٹ کارڈ، جس کا رنگ اڑ چکا تھا، کارل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''چار سال پہلے! چار سال!'' اس نے دوبارہ پیٹ پر ہاتھ باندھ لیے۔

کارل نے پوسٹ کارڈ پڑھا جو فوجی حکام کی طرف سے آیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ رچرڈ چار ستمبر ۱۹۱۴ء کو لڑتے ہوئے مارا گیا۔ کارل نے کارڈ کو الٹ کر دیکھا، دوبارہ سیدھا کیا، دوسری دفعہ مضمون پڑھا، اور مسکرایا: ''یہ سب غلط ہے، اینا! یہ سب غلط ہے۔''

اس نے اینا کا ہاتھ تھامنے کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ ''کیا فضول باتیں یہ لوگ لکھتے ہیں... میں جو کہہ رہا ہوں اسے سچ جانو۔''

وہ اتنے جوش میں تھا اور خوشی اس میں یوں رچی ہوئی معلوم ہوتی تھی کہ لحہ بھر کے لیے اینا نے اپنا ہاتھ اس سے نہ چھڑایا۔ اینا کے چہرے پر خوف کے آثار تھے، اور اس عورت کی سی دیوانی امید تھی جو، اپنے میاں کی وفات کے بعد جلد ہی، اس امید کو دل میں جگہ دے سکتی ہو کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور پہلے کی طرح اس کا پیارا شوہر گھر میں قدم رکھے گا۔

اینا نے اس مسئلے کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ''شاید تمھیں بھوک لگی ہے؟'' اگلے لمحے اس نے سوچا: میں اسے چلتا کردوں گی۔ میں شور مچا کر مدد کے لیے پڑوسیوں کو بلالوں گی۔ اس اثنا میں اس نے ڈبل روٹی کاٹی، میز پر چھری کانٹا لگا دیا، اور اس کی رکابی میں ساسج کا ٹکڑا رکھ دیا۔ کیا اس کے لیے سیب چھیلنا چاہیے؟

''سچ مچ تم بھول تو نہیں گئی ہو کہ...''

خیال کی سی تیزی سے لہو کی تمتماہٹ اینا کے ماتھے پر دوڑ گئی۔ اس نے ہنر مندی سے، مشینی انداز میں، سیب چھیلا، اس کے چار حصے کیے، بیچیلا حصہ کاٹ کر پھینک دیا۔

کارل کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ایسی عورت اسے کھانا کھلا رہی تھی جس سے اسے محبت تھی۔

اتفاقاً نظر اٹھا کر دیکھنے سے اینا کو پتا چلا کہ کارل کتنا متاثر تھا اور ایک لحاتی مسکراہٹ نے، جسے بمشکل محسوس کیا جاسکتا ہے، اس کے چہرے کی گہری سنجیدگی کو ختم کر دیا۔ اس نے رکابی کھسکا کر کارل کے ذرا اور قریب کر دی۔

''وہ پرانا کانٹا کیا ہوا جس میں تین شاخیں تھیں اور ایک شاخ باقی دو سے چھوٹی تھی؟''

اینا برتنوں کی الماری کی طرف اس طرح گئی جیسے خواب میں چل رہی ہو اور کانٹا لے آئی۔

''یہی ہے وہ،'' اس نے مطمئن ہو کر کہا اور نظر اٹھا کر اینا کو دیکھا جو بیٹھ گئی تھی اور ابھی تک اپنے خواب میں محو تھی۔

وہ لیمپ کے نیچے بیٹھے تھے، چار دیواروں کی بدولت باہر کی دنیا سے بالکل علیحدہ۔ گیس کے لیمپ کی جالی گنگنا رہی تھی۔ کارل کے دائیں طرف بستر تھا؛ بائیں طرف برتنوں کی الماری؛ اور سامنے، پرانا صوفہ کمرے میں ٹیڑھا اڑا ہوا رکھا تھا۔ کھڑکی چھوٹی اور چوکور تھی۔ اچارے ہوئے پھلوں کی خوشبو اور آٹے کی ٹھنڈی ٹھنڈی باس پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار میں جڑے ہوئے تختے پر پھلوں سے بھری ہوئی چھ اچاریاں آرائش کے انداز میں رکھی تھیں۔

جب دو آدمی سالہا سال مسلسل ساتھ رہیں تو وہ ایک دوسرے کے چھوٹے موٹے طور طریقے اپنا لیتے ہیں — اعضا کی حرکات، الفاظ۔ اس مرد نے، رچرڈ ہی کی طرح، روٹی کو لمبے لمبے ٹکڑوں میں کاٹا۔ اینا دہشت زدہ ہو کر اسے دیکھتی رہی۔

کارل اس کی تنہائی میں، جو برسوں پر محیط تھی، در آیا تھا اور اس نے، اپنے تقاضوں، اپنے جذبوں، اپنی فضا سے، اینا کے اندر مزید زندگی کی آرزو بیدار کر دی تھی۔ کارل کے ذریعے جن احساسات کو آزادی ملی تھی وہ اینا کی عقل کی عین ضد تھے۔ جن لمحوں میں وہ سوچنا ترک کر دیتی، اسے یقین آ جاتا۔

''پیر کو جا کر کوئی ملازمت تلاش کروں گا، کیوں؟''

پھر تو مجھے کارخانے میں کام کرتے رہنے کی ضرورت نہیں، اینا نے سوچا۔ پھر تو ہر چیز بالکل ویسی ہی ہو جائے گی جیسی پہلے تھی، بلکہ، شاید پہلے سے بہتر... ''تم یہ کیوں کہتے ہو کہ تم میرے شوہر ہو؟ تم کیوں کہتے ہو یہ؟''

''لیکن، اینا، اینا!''

''مجھے وہ اتنا پیارا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے اچھا سلوک کرتا تھا، ہمیشہ اچھا سلوک۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔''

حسد کی ایک لہر نے کارل سے اس کی خود اعتمادی چھین لی، اور پہلی مرتبہ اس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولنا شروع کیا، اس ڈر سے کہ کہیں وہ عورت، جسے وہ سمجھے بیٹھا تھا کہ جیت چکا، اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

اس نے رکابی پیچھے ہٹا دی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کھڑکی کے پردے نئے ہیں؟ جو پردے ہم نے خریدے تھے ان کا رنگ زرد تھا۔ دست فروش نے کہا تھا یہ بڑے فائدے کا سودا ہے۔ تمھیں یاد ہے؟''

''مجھے یاد ہے، میرے خدا!''

''فرنیچر کی قسطوں کا کیا بنا، اینا؟''

''ان چار برسوں میں مجھے قسطیں چکانے کا وقت مل گیا تھا۔''

کارل نے اپنے ابرو پر ہاتھ پھیرا، جیسے کوئی دوسرا مرد اپنی مونچھوں پر پھیرتا۔ یہ عادت اس نے رچرڈ سے سیکھی تھی۔ اینا صدمے کے احساسات کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔

''پھر ہم بہت زیادہ دقت اور ذمے داری کے بغیر زندگی کو ازسرِ نو شروع کر سکتے ہیں... اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اینا... میری طرف دیکھو... میری طرف دیکھو تو، اینا۔''

اینا کا سر جھک کر سینے سے لپٹے ہوئے بازوؤں سے جا لگا۔

''تمھیں پھر سے اس کا عادی ہونا ہی پڑے گا۔''

کارل کے ہاتھ کے لمس سے، جو مسلسل اور نرمی سے اینا کے بال سہلا رہا تھا، اس کے جسم کی کپکپاہٹ رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے میں نرمی آ گئی، اور ساتھ ہی زیادہ سنبھلا سنبھلا نظر آنے لگا۔ اس نے میز صاف کی۔

کارل کمرے کے ایک کونے میں، سر جھکائے، چپ چاپ کھڑا رہا۔

اس لمحے ایک غلط لفظ، ایک غلط لہجہ انھیں ایک دوسرے سے اس طرح الگ کر دیتا جیسے چاقو کسی چیز کو کاٹ دے۔

اینا کے مجموعی رویے سے — جس طرح اس نے میز کی برائے نام بے ترتیبی کو سنوارا، بار بار بلا طلب اس کی طرف دیکھا، کھڑکی بند کی اور پردے کھینچ دیے — کارل نے جانا کہ وہ یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ اس نئے واقعے کے بارے میں اپنے موقف کا تعین کرے گی اور دیکھے گی کہ اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔

کارل نے جو پوچھا اینا نے اس کا فوراً جواب دیا، اسے بتایا کہ وہ بورڈ کے ڈبے بنانے والی ایک فیکٹری میں ملازم ہے اور اسے کتنی تنخواہ ملتی ہے۔ یہ بتاتے وقت وہ بجے رے نیئم کے دونوں پودوں سے کمھلائے ہوئے پھول توڑتی رہی۔

اس کے بعد کوئی کام باقی نہ رہا۔ وہ سونے کے لیے تیار تھی۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے کمر ٹیک کر کھڑی ہو گئی۔

ان کے مابین ایک کھنچاؤ پیدا ہوا جیسا کہ ان پریمیوں کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے جو ابھی گہرے طور پر بے تکلف نہ ہوئے ہوں اور خود کو کسی کمرے میں تنہا پائیں۔

''میرے پاس پورے پینتیس پفینگ (۱) ہیں،'' کارل نے اچانک بشاشت کی رو میں بہہ کر کہا۔

اینا نے انگلی سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم وہاں سو سکتے ہو۔'' اور اس کا ہاتھ فوراً کھڑکی کی

(۱) ایک چھوٹا جرمن سکہ

چوکھٹ پر واپس چلا گیا۔

جب کارل نے صوفے سے نظر ہٹائی اور دوبارہ اینا کی طرف دیکھا تو وہ کپڑے کے صندوق تک پہنچ بھی چکی تھی۔ اس نے سب سے اچھی چادریں چنیں اور خود اپنے بستر سے ایک تکیہ اٹھا کر اس پر غلاف چڑھایا۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم اسے کھسکا کر دیوار کے ساتھ ملا دیں،'' وہ بولی۔ انھوں نے مل کر صوفے کو کھسکایا اور دیوار سے ملا دیا۔

اینا ہو بہو اسی انداز میں بستر بچھانے کے لیے جھک گئی جس طرح کارل نے ہزاروں میل دور میدان میں لیٹے لیٹے اسے بستر بچھاتے دیکھا تھا۔

''میں روشنی بجھا دوں گی،'' اینا نے کہا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔

کپڑے اتارتے ہوئے وہ ایک دفعہ رکا اور بالکل ساکت ہو کر ان دھیمی آوازوں کو سننے لگا جو اینا کی طرف سے آ رہی تھیں۔ اور فوراً ہی اینا نے بھی، اس حالت میں کہ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے اور دونوں ہاتھ آدھی اتری ہوئی جراب پر دھرے بیٹھی تھی، ہلنا جلنا موقوف کر دیا۔

وہ پیٹھ کے بل لیٹا، دونوں ہاتھ سر کے نیچے دھرے اور آنکھیں کھولے، کان لگائے رہا۔ کچھ دیر تک اسے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ''کیا تم لیٹ گئی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

اس نے اپنا سوال دہرایا۔ اور اینا کے ''ہاں'' کہنے کے انداز سے اسے پتا چل گیا کہ وہ بھی آنکھیں کھولے پڑی جاگ رہی تھی۔

شہر کا گھٹا گھٹا شور و غوغا، جس کی دھن میں قریب اور دور کی موٹروں کی پیں پیں کی تکرار رچی ہوئی تھی، کمرے کے عمیق سکوت کو گھیرے ہوئے تھا۔

آہٹ کی مانوسیت کے ڈر سے اینا بستر میں ہلی جلی تک نہیں۔ جب تک اینا نے کارل کو باقاعدگی سے سانس لیتے سن نہ لیا اس تکلیف دہ وضع کو، جس میں وہ لیٹی ہوئی تھی، نہ بدلا، اور بدلا بھی تو بہت محتاط ہو کر۔

ہفتوں بعد کارل کو صاف ستھرے بستر پر سونا نصیب ہوا تھا۔ بہت زیادہ مشقت کی وجہ سے اس کی ٹانگوں کے عضلات پھڑک رہے تھے۔ دریاؤں کے کڑاڑے، پانی کی چوڑی چمکیلی چادریں، پتھریلی کھڑی چٹانیں، اندھیرے جنگل، ختم نہ ہونے والی سفید سڑکیں، بعید مناظر، اور روشن قریبی جزئیات اس کے ذہن میں تھرتھرا رہی تھیں، جیسے فطری مناظر کی کسی فلم کو ہزار حصوں میں کاٹ کر الٹا پلٹا جوڑ دیا گیا ہو۔

پھر لڑکپن میں دیکھا ہوا فطرت کا ایک منظر اس کے سامنے وا ہوا، جو اس کے خواب دیکھنے والے ذہن کا خوب جانا پہچانا تھا۔ وہ دوبارہ دس برس کا لڑکا بنا، باپ کے ہمراہ قصبے سے نکل کر، کھیتوں کھیتوں ہوتا

ہوا، ایک گاؤں کی طرف چلا جا رہا تھا جو اتوار کی صبح کی تازگی میں آسان ڈھلانوں اور چڑھائیوں والی پہاڑیوں کے درمیان واقع تھا۔

وہ گاؤں کی سرائے میں داخل ہوئے اور ایک پرانے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ قریب ہی باغ تھا، پھولوں سے دمکتا ہوا۔ بوڑھا کسان پاس سے گزر کر باہر، پُرامن گاؤں کی سڑک پر چلا گیا۔ اس نے سر کی جنبش سے انھیں سلام کیا تھا۔

کارل کا باپ سرائے والے کی لڑکی کو چھیڑ رہا تھا۔ اس نے لڑکی کا بازو پکڑ لیا۔

"تمھیں اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہیے،" کارل نے کہا۔ "یہ اینا ہے۔"

اس کے باپ نے فوراً اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

پھر سرائے والے کی بیٹی نے کارل کے گلے میں بانہہ ڈالی اور ممتا بھری نظر سے اسے دیکھ کر دودھ کا ایک بڑا سا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

سلامتی اور مسرت کے ایک پُرامن احساس کے ساتھ کارل خواب سے جاگا۔

اینا سو رہی تھی۔

یکا یک انتہائی بیش بہا ذمے داری کے احساس سے بے قرار ہو کر اس نے سوئی ہوئی، سانس لیتی عورت کے اسرار کو سنا۔ تشکر کا احساس اس پر غالب آ گیا۔

۳

نالی دار لوہے کے سائبان کے نیچے رچرڈ سفری پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ "اچھا، سنو!" اس نے کہا، اور ہونٹ سکیڑ کر اپنے گھر میں نصب گیس کے چولھے کی سیٹی کی نقل اتاری۔

سیاہی مائل ریل گاڑی میدان میں تیزی سے چلتی رہی؛ افق کی ہریالی میں، باریک لکیر کی شکل میں، رینگتی رہی۔ کارل نے دور کہیں ایک آواز سنی، کسی انجن کی بہت دور سے، بہت طویل، بمشکل سنائی دینے والی سیٹی، جو رچرڈ کے احتیاط سے سکڑے ہوئے ہونٹوں سے برآمد ہو رہی تھی۔ کارل نے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں صبح کی دھوپ بھری ہوئی تھی۔ گیس کے چولھے پر، جس کی ٹونٹی سے کوئی رکاوٹ پیدا ہو جانے کی وجہ سے یکساں سُر میں سیٹی کی آواز آ رہی تھی، ابلتے ہوئے پانی سے بھرا المونیم کا کرچھا رکھا تھا۔ اینا کا بستر خالی تھا، چادر پائنتی پڑی تھی۔

"چار؟ لیکن تم تو کبھی دو سے زیادہ نہیں لیتیں،" نانبائی نے ویسی دو بھاری ڈبل روٹیاں اور نکالنے

کے لیے، جیسی اینا کو پسند تھیں، بل دار ڈبل روٹیوں کے انبار کو ٹٹولا، ''اور اب تمھیں چار چاہییں؟''

خوشی کے اچانک احساس نے اینا کے اندر ایک مسکراہٹ جگائی اور شرم سے لال چہرے پر ثبت کر دی۔ دانتوں کی دونوں لڑیاں بہت بڑی، سڈول اور سفید تھیں۔

اینا کی رنگت، ان لوگوں کی طرح جن کے بال سرخ ہوتے ہیں، دودھیا تھی، گو خود اس کے گھنے بالوں میں سرخی کی جھلک مشکل ہی سے نظر آتی تھی۔ اس کی ناک کے دونوں طرف، آنکھوں کے قریب، چند جھائیاں تھیں۔

کئی برس کارڈ بورڈ کے ڈبے بنانے والی فیکٹری میں کام کرتے کرتے اینا کے ہاتھ، روزانہ لاکھوں جنبشیں کرنے کی وجہ سے، نازک اور اعصابی بن گئے تھے، جیسے ان نزاکت آگیں عورتوں کے ہوتے ہیں جو پشتہا پشت کی خاندانی شادیوں اور اچھی تعلیم و تربیت کی پیداوار ہوں۔

پاؤں میں، جو اس کی کاٹھی کے اعتبار سے قدرے چھوٹے تھے، اینا نے اپنے بہتر جوتے پہن رکھے تھے، ایک مہین ٹھنڈی فراک زیب تن تھی اور چست کپڑے میں اس کے جسم کی گولائیاں یوں نمایاں تھیں کہ ان میں برہنگی کی فطری معصومیت باقی رہ گئی تھی۔ جب وہ ہاتھ میں ایک بڑا سا، لبالب، دودھیا رنگ کا مٹی کا جگ اٹھائے اندر آئی تو کارل گیس کے چولھے پر جھکا ہوا تھا۔

میں اسے جنگ سے پہلے ٹھیک کرنا چاہتا تھا، اس نے سوچا۔ اینا کی موجودگی کا اثر اتنا گہرا تھا کہ اس نے یہ بات زور سے نہ کہی گو اس لمحے، اس کے احساس کے مدنظر، وہ جھوٹ نہ رہتی۔

اینا بنی ٹھنی لگ رہی تھی جیسے اس نے پھول پہن رکھے ہوں۔

کارل نے اس عورت کو دیکھا جو، دودھ کی طرح تازہ تازہ، دروازے میں کھڑی تھی اور بلا ارادہ اپنی کھلی قمیص کے دونوں کناروں کو کھینچ کر اپنے سنولائے ہوئے، گٹھیلے، سیاہ بالوں سے بھرے سینے کو ڈھک لیا۔ اس نے کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ صرف پتلون اور پیٹی۔ اس کی سفید قمیص میں سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دن پہلے اس نے اپنے جسم اور قمیص کو ایک دریا میں دھویا تھا اور پھر دونوں کو دھوپ میں سکھایا تھا۔

اگرچہ کارل شیو بنا اور نہا چکا تھا، ندی اور بن اور طول طویل سفر کی جنگلی خوشبو اس سے دور نہ ہوئی تھی۔ اس طرح وہ مہذب دنیا میں واپس پہنچا تھا، جہاں ایک پلنگ تھا، چار دیواریں تھیں اور اینا تھی۔

اینا نے کہا، ''صبح بخیر،'' اور اس کی آواز، اس کی وضع قطع، چال ڈھال، جسم اور منھ سے عین مناسبت رکھتی تھی۔

جس انداز سے اینا نے دودھ کا جگ میز پر رکھا، ذرا جھک کر کہ اسی بغل میں اس نے ڈبل روٹیوں سے بھرا کاغذی تھیلا دبا رکھا تھا، اس سے اس کا سارا جسم نمایاں ہوگیا۔

اینا نے بڑے قرینے سے، گویا کسی بے تکلف ضیافت کے لیے، ناشتہ چنا، ترتیب کی اثر آفرینی کا جائزہ لیا، اور آخر میں بڑی احتیاط سے دو کاغذی نیپکن تہہ کیے۔ پورے وقت، ایک مرد، کھڑکی کے پاس کھڑا، دیکھا کیا۔

گزشتہ شام کا حجاب غائب ہو چکا تھا۔ اینا بالکل بدل گئی تھی، جیسے اسے، رات کو سوتے ہوے، غیر متوقع طور پر یہ یقین آ گیا ہو کہ وہ زندگی کے لیے تیار ہے۔

کارل کی آنکھیں ہر طرف اس کا تعاقب کرتی رہیں؛ اور جب اینا نے پھلوں کی ایک اچاری لانے کی غرض سے اس کے قریب سے گزرنا چاہا تو کارل کو اپنے اظہارِ محبت کے لیے نہ الفاظ میسر آئے نہ وقت ملا۔

اینا کا جسم اس کی آغوش میں اس طرح کانپا جیسے طوفان کے پھٹ پڑنے سے پہلے جنگل کا درخت کانپتا ہے۔

کارل کے گلے میں بانہہ ڈالے وہ پھسل کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”پہلے کھالو!“

کارل نے اس کے الفاظ میں نہاں وعدے کو سنا۔

اینا نے اس کے لیے روٹی بنائی اور اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر اسے پیش کر دی۔ وہ خود کچھ نہ کھا سکی۔ گود میں ہاتھ دھرے اسے دیکھتی رہی۔

”کیسے نازک اور چھوٹے ہاتھ ہیں تمھارے! جیسے کسی امیرزادی کے!“

وہ جھینپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی کی طرف چلی گئی۔

اینا کی اقرار اور اضطراب بھری مسکراہٹ کی کشش میں گرفتار ہو کر کارل دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھا اور آہستہ سے اس کے گرد اپنا بازو ڈال دیا۔ وہ ایک دوسرے کو تھامے ہوے، بے حرکت کھڑے رہے۔

اور جب کارل نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور اینا کے ہونٹوں کو لرزاں اور وا پایا، اور انھیں بار بار چوما، تب بھی کوئی لفظ نہ بولا گیا۔ مہین کپڑا بڑی چستی سے اینا کی چھاتیوں اور شانوں کو ڈھانپے ہوے تھا۔ کارل نے بٹن کھول دیے۔

کمزور سی مسکراہٹ کے ساتھ اینا نے خود ہی کندھے کی ڈوری ڈھیلی کر دی اور لباس کے نیچے پھسلتے ہی کارل کی طرف گر گئی۔ بستر کی سفید چادر پر دھوپ پورے زور سے پڑ رہی تھی۔

کارل نے بڑے زور سے پٹی کو جھٹکا دے کر اوپر کھینچا اور پیچھے ہٹا؛ اسے کواڑوں اور کواڑوں میں لگنے والے تالے اور تالے میں لگنے والی چابی کی نعمت کا عمیق طور پر ہوش تھا۔

پھر وہ دوبارہ اینا کے سامنے، جہاں وہ دھوپ میں لیٹی تھی، کھڑا تھا اور قائل ہو چکا تھا کہ دنیا کی کوئی خوشی اس بات کے مقابلے میں نہیں ٹھیر سکتی کہ آدمی کو اپنی محبوبہ پر اور اس کی سپردگی کا یقین ہو۔

کارل وہاں اپنے راحت آمیز اعتماد میں محو کھڑا رہا یہاں تک کہ اینا نے، جو گویا کارل کی نگاہوں میں ڈوب چکی تھی، ٹراؤٹ مچھلی کی طرح اچھل کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

وہ رہائشی علاقہ چھ خستہ حال بلڈنگوں پر مشتمل تھا۔ ان بلڈنگوں سے ایک وحشت ناک بلاک وجود میں آیا تھا جس میں تین صحن تھے۔ وہاں سو سے زیادہ کاریگروں کے خاندان آباد تھے جن کی قسمتوں پر جنگ کے اتفاقات کا حکم چلتا تھا؛ اور جنگ نے ان سب کو ایک سی تکلیف اٹھانے، ایک سی مفلسی سہنے، ایک سی خوراک کھانے اور ایک سی بیماریوں کا شکار ہونے کی سزا دے رکھی تھی۔

جگہ جگہ سے بچوں کے رونے کی آواز اس طرح بلند ہو رہی تھی جیسے کسی دلدلی جوہڑ میں مینڈک ٹرا رہے ہوں؛ وہ اکثر یک زبان ہو کر کئی کئی منٹ تک سنگت میں روتے؛ ایسا تو کبھی ہوتا ہی نہ تھا کہ وہ کافی دیر تک بالکل چپ رہے ہوں۔ اتوار کی صبح کو وہ دھنوں کی اس سنگت میں رو رہے تھے جو زندہ دلی سے ماؤتھ آرگنوں پر بجائی جا رہی تھیں۔

ایک نوخیز لڑکی چھلانگ مار کر بستر سے اٹھی اور اس نے کھلی کھڑکی کی چوکھٹ پر لگی ہوئی باریک آواز والی سائیکل کی گھنٹی بجائی اور کان پر ہاتھ رکھ لیا۔

لمحے بھر بعد ایک نوخیز لڑکی شبینہ لباس پہنے سامنے کی کھلی کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ اس نے اپنی طرف کی سائیکل کی گھنٹی بجائی اور اپنا ہاتھ اس طرح اٹھایا جیسے وہ فون سننے کا آلہ ہو۔ "ایلفی بول رہی ہے!"

"صبح بخیر، ایلفی! ایلما بول رہی ہے۔ رات اچھی گزری؟"

"اوہ، تم ہو، ایلما۔ بڑی مہربانی تمھاری کہ مجھے فون کیا!"

یہ سہیلیاں ایک ہی منزل پر رہتی تھیں اور ٹیلیفون کرتے وقت آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ درمیان کا صحن صرف اٹھارہ فٹ چوڑا تھا۔

"تم کیا پہنو گی آج، ایلما؟ میں تو اپنا نیلا فراک پہنوں گی۔"

"میرا خیال یہی تھا کہ تم ایسا کرو گی۔ میرا خیال اپنا زرد فراک پہننے کا ہے۔"

اتوار کو پہننے کے لیے ان کے پاس بس ایک ایک فراک ہی تھا، لیکن کبھی کبھار وہ فراک بدل کر اپنے ملبوسات میں اضافہ کر لیتی تھیں۔

"میرا خیال ہے ہم آج شام پکچر دیکھنے چلیں گے... یہ کیسا ہولناک شور ہو رہا ہے؟"

چوتھی منزل کے ایک کمرے میں، جہاں اینا کی ایک سہیلی رہتی تھی وہ اوپر سے کئی مرتبہ اینا کے کمرے کی کھڑکی کی طرف منھ کرکے بے سود آواز دے چکی تھی۔ ایک سیاہ ولکنائٹ کا توا، جس پر قرنا کے سامنے بیٹھے ہوئے کتے کا نشان بنا تھا، گھمر گھمر کسی عسکری کوچ کا نغمہ بجا رہا تھا جس کی دھن پر لاکھوں آدمی مارچ کرتے ہوئے میدان جنگ کی طرف جا چکے تھے۔

''یہ شور و غل ناقابلِ برداشت ہے۔ میں فون بند کرنے لگی ہوں۔ بعد میں تمھیں دوبارہ فون کرلوں گی۔ اس وقت تک کے لیے رخصت۔'' ایلفی نے سائیکل کی گھنٹی بجائی۔ ایلما کی گھنٹی کی باریک آواز عسکری کوچ سے بلند ہوکر سنائی دی۔ دونوں لڑکیاں غائب ہوگئیں۔

بالکل نیچے، کنکریٹ کے چوکور فرش پر، ایک بھورے بالوں والا چار سال کا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ آسمان کی طرف منھ اٹھا کر چیخ رہا تھا:

''میر بخین کے بچہ ہوا جی بچہ ہوا
ماں کو یہ پتا نہیں، بچے کا باپ کون ہے''

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بستر میں اینا چونک اٹھی اور اس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ لیٹر بکس میں سے اخبار نیچے گرا۔

''تم تو مختلف ہوا کرتی تھیں، اینا۔ تم زیادہ شرمایا کرتی تھیں۔'' وہ پیٹھ کے بل لیٹا اوپر دیکھ رہا تھا اور اس خیال میں محو تھا کہ پہلے اس کے ساتھ اینا کا رویہ کتنی بڑی حد تک شرم و حیا کا حامل ہوا کرتا تھا۔ ''کیا تمھیں وہ بہانہ یاد نہیں جو تم ہمیشہ بنایا کرتی تھیں، ہر مرتبہ، اس سے پہلے کہ تم — اس بات پر تیار ہونے سے پہلے؟ اور تم ہمیشہ ایک اَور انداز سے لیٹا کرتی تھیں۔''

اینا بغیر کسی قصد کے کارل سے ذرا الگ ہوگئی اور، اس بات پر حیران ہوکر کہ وہ اس عادت سے بھی آشنا تھا جو اس تمام عادتوں میں سب سے زیادہ محرمانہ تھی، اس کا منھ تکنے لگی۔ اینا کا چہرہ تحیر سے پھیل گیا اور یکایک خیالات سے بالکل خالی ہوگیا، جیسے کہ سوچنے کی صلاحیت کو اس کے اندر سے چاقو سے تراش کر نکال لیا گیا ہو۔

''بالکل مختلف!'' کارل نے نرم دباؤ ڈال کر اینا کی مزاحمت کرتی ہوئی دائیں ٹانگ کی وضع بدل دی اور اس کے دائیں کندھے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''اس طرح!''

اینا کا سر خود بخود پیچھے کو ڈھلک گیا۔ لیٹنے کے اس جانے پہچانے انداز میں وہ ساری پچھلی زندگی جو رچرڈ کے ساتھ گزری تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ سپردگی کے وقت اینا نے، آخر کار پوری طرح قائل ہوکر کہ اس کی بانہوں میں جو مرد تھا وہ واقعی رچرڈ ہی تھا، زیرلب رچرڈ کا نام لیا۔ اس لمحے، اینا کے

لیے ماضی اور حال کے دھارے ایک دوسرے سے آملے اور ایک ہو گئے۔

اگلے چند گھنٹوں میں اینا کو یہ یقین برقرار رکھنے کے لیے ایک باطنی جدوجہد کرنی پڑی کہ کارل اس کا شوہر ہے۔ اور اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اگر آدمی کسی یقین کو بالجبر جنم دینے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو بھی کم از کم کسی خلل ڈالنے والے خیال کو پاس پھٹکنے سے باز رکھ سکتا ہے۔

اینا کے سینے میں، معدے سے اوپر، وہ نفسیاتی عضلہ تھا جو اسے مسلسل بروئے کار لانا پڑتا بشرطیکہ وہ اس ہٹیلے معترضانہ خیال کو کچلنا چاہتی کہ کارل رچرڈ نہیں ہے۔

کارل، جو اینا کی محبت میں سراپا محو تھا، ایسے تمام شبہات سے پاک تھا۔ جتنی دیر وہ اطمینان سے اینا سے بوس و کنار کرتا اور، خوشی سے مدہوش ہو کر، اینا کے بوس و کنار کو قبول کرتا رہا، اس کا ذہن ان ذرائع کے متعلق سوچنے میں مصروف ہو چکا تھا جن کی مدد سے، محنت شاقہ کر کے اور اپنی قوتوں سے کام لے کر، وہ اینا کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی مطلوبہ بنیادوں کو پکا کر سکتا تھا۔

رچرڈ نے — شہر میں وارد ہونے کے روز سے جنگ برپا ہونے تک — ایک ہفتے کپ اور گراف کی مشین فیکٹری میں کام کیا تھا اور اپنی تنخواہ سے مطمئن نہ تھا۔

جب اینا کپڑے پہن رہی تھی تو کارل نے اسے بتایا کہ وہ کپ اور گراف کے یہاں کام تلاش نہیں کرے گا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک کم حیثیت فرم تھی اور وہاں بہت معمولی تنخواہ ملتی تھی۔

ایک بہت واضح یاد کے اچانک لمس سے اینا کانپ اٹھی۔ وہ احساس فوراً ہی تہہ میں بیٹھ گیا۔ اینا کو ابھی تک یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زمین سے اوپر تیر رہی ہے: یہ کیفیت کلی طور پر جذباتی تھی اور اس قدر سیال اور خوشگوار کہ ناقدانہ سوچ اس میں زبردستی در آنے سے ابھی تک قاصر تھی۔

جب وہ دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ مزید خریداری کرنے سیڑھیوں سے اتر کر جانے لگی تو اسے زینہ بدلا بدلا محسوس ہوا۔ وہ مانوس تو اب بھی تھا لیکن اپنی مانوسیت کے باوجود عجیب طرح سے مختلف تھا۔ سیڑھیاں اترنے والی عورت بدل چکی تھی۔

پھر دھوپیلی سڑک آئی اور مختلف ہوا، صبح کی تازہ ہوا، کھڑنجوں پر گہما گہمی۔ ایک چھوٹی سی بڑھیا ہاتھ میں ٹوکری لٹکائے لنگڑاتی ہوئی گزری۔ بچے کھیل کھیل میں ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ایک قصاب کا ٹھیلا گھڑ گھڑ کرتا تیزی سے گزر گیا۔ دو کاریگر اتوار کے لیے مخصوص پتلون قمیص پہنے اپنے دروازوں کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اینا کو دکان پر جانا اور قصائی کو بتانا پڑا کہ اسے کتنے گوشت کی ضرورت ہے۔ اسے حساب لگانا پڑا۔ اسے اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ کھانا دو آدمیوں کو کافی ہو سکے۔ اسے سوچنا پڑا۔ احساس پسپا ہو گیا۔ سوچ غالب آ گئی۔ اینا کے جسم کا تمام بوجھ کندھوں کے نیچے ہی نیچے بیٹھتا گیا۔ اس کا سر،

صاف اور آزاد ہوکر، اوپر کو اٹھ گیا۔

''نہیں، یہ کافی نہ ہوگا۔ مجھے چوتھائی پونڈ اور دے دو،'' اینا نے قصائی سے کہا۔

کیوں کہ اوپر اس کے کمرے میں ایک مرد تھا۔ اسے بھی غذا کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس ایک ملاقاتی ٹھیرا ہوا تھا — ایک ملاقاتی۔

ہاں، لیکن ایک عظیم خلیج نے اسے اپنے ملاقاتی سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس مرد کو جو وہاں اوپر اس کے کمرے میں ٹھیرا ہوا تھا، اینا سے کیا سروکار تھا؟ وہ کل آیا تھا۔ چار سال تک اینا نے ہر دن تنہا رہ کر گزارا تھا، اور پھر، کل، ایک اجنبی مرد اس کے پاس آیا تھا۔

اور اس صبح؟ اس صبح کیا ہوا تھا؟ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ''میں کچھ یخنی بنانے کے لیے ایک ہڈی بھی لوں گی۔'' یہ کیوں کر ممکن ہوگیا؟ ایک اجنبی مرد — یہ تو ہولناک بات ہوئی۔ اینا نے دہشت زدہ ہوکر چاروں طرف دیکھا۔

گھر جاتے ہوئے راستے میں اسے ایک جاننے والی مل گئی، جو آٹے اور تلنے والی چربی کی قیمتوں میں مزید اضافے کا رونا رو رہی تھی۔ اینا بوکھلائی ہوئی اسے دیکھتی رہی۔

''ہاں، گھر کے ہر ہفتے کے اخراجات پر اس کا کیا اثر ہوگا؟'' اس کی شناسا نے حساب لگایا۔

اینا کو گھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ جو وہاں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ گھر پہنچ کر اسے کوئی نہ ملے۔ وہ تنہائی میں ان باتوں پر غور کرنے کی خواہش مند تھی۔ ہر بات کو سوچ کر سلجھانا چاہتی تھی۔ اسے اب کیا رویہ اپنانا چاہیے؟ ان سب باتوں کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

اینا کا تجربہ ان متعدد عورتوں کے تجربے سے مختلف نہ تھا جنھیں، اپنی یار بازی کا محل وقوع چھوڑنے کے بعد، سڑک پر، بدلی ہوا اور کھڑنجوں کی گہما گہمی میں پہنچتے ہی، یک لخت ہوش آ جاتا ہے اور وہ سمجھ نہیں سکتیں کہ کیا کر بیٹھی ہیں۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اینا پر اس بے وفا بیوی کے تمام احساسات کا بوجھ تھا جو کسی آشنا سے مل کر اپنے گھر لوٹ رہی ہو۔

وہ پہلی اور دوسری منزل کے زینوں کے درمیانی چبوترے پر ٹھیر گئی۔ ایک مرد باہر کی دنیا سے آتا ہے، اس دنیا سے جو اتنی بڑی ہے جتنی کہ... باہر کی دنیا سے میرے پاس، میرے کمرے میں، آتا ہے اور میری پچھلی ساری زندگی سے واقف ہے — مجھ سے بھی زیادہ اچھی طرح واقف ہے۔ میرے کپڑے اتارنے سے پہلے (میں ایسی حرکت کیوں کر بیٹھی!) اس نے مجھے بتا دیا کہ میرے بدن پر وہ تینوں تل کہاں ہیں۔ وہ یکایک میرے پاس آ کر ان چیزوں کی یاد میرے ذہن میں تازہ کرتا ہے جنھیں میں خود بالکل بھول

چکی تھی۔ تمام وقت اینا کھڑی زینے کی دیوار پر اسٹینسل سے بنے ہوئے بیل بوٹوں کو تکتی رہی۔

وہ دو منزلیں اور چڑھ کر اپنی سہیلی کے پاس جانے کو ترجیح دیتی۔ وہاں ہر شے محفوظ اور جانی پہچانی تھی؛ گزشتہ چار برس سے جیسی تھی، بالکل ویسی ہی۔ وہ اپنی سہیلی کو سب کچھ بتا سکتی تھی۔ شاید سہیلی کو پتا ہوگا کہ اسے کس طرح کا مشورہ دینا چاہیے۔ لیکن اس کے اپنے کمرے میں کرسی پر ایک مرد کی سفید قمیص ٹنگی ہوئی تھی۔ بے ترتیبی... جب وہ اندر قدم رکھے گی تو وہ کیا کر رہا ہوگا؟ وہ کہاں کھڑا ہوا ہوگا؟ کھڑکی کے پاس؟ یہ بالکل درست تھا: کھڑکی کے پردے نئے تھے۔ اور جب انھوں نے دوسرے پردے خریدے تھے— پرانے والے پردے، رچرڈ نے اور اس نے— رچرڈ جو مر چکا تھا، جسے مرے ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ میرے خدا، بے شک وہ مر چکا تھا!— تو دست فروش نے کہا تھا: ''یہ بڑے فائدے کا سودا ہے''۔ اس نے لفظ بہ لفظ، یہ کہا تھا: ''یہ بڑے فائدے کا سودا ہے۔'' دست فروش کی چھوٹی چھوٹی کالی مونچھیں تھیں جنھیں بہت باریک کترا گیا تھا، اور اس کے ماتھے پر دو پھنسیاں تھیں۔ وہ پھنسیاں رچرڈ نے اسے اشارہ کر کے دکھائی تھیں۔

میں صرف کل ہی تو اس سے آشنا ہوئی ہوں۔ یہ اس کے لیے ناممکن ہے کہ مجھے اینا کہہ کر پکارے، اینا نے دروازے کا دستہ گھمانے سے پہلے سوچا۔ وہ بہروپیا ہے۔ بہروپیا!... اور میں نے اس کے ساتھ وہ بات کی! اس کے سینے میں غصہ اور شرم اور کراہت تھی۔

کارل نے بستر ہٹا کر صوفے کو دیوار کے ساتھ ملا دیا تھا۔ ناشتے کی میز جھاڑی پونچھی جا چکی تھی۔ اینا کا بستر بھی، قدرے بھونڈے پن سے، حسب ضرورت ہمواری کے بغیر، تہہ کر دیا گیا تھا۔ سارا کمرہ صاف ستھرا معلوم ہو رہا تھا۔ جب وہ اندر آئی تو کارل لمبے دستے والی جھاڑو سے دوسری بار صفائی کر رہا تھا، گرد کو ذرہ ذرہ سمیٹ رہا تھا۔

رچرڈ بعض مرتبہ گھر کا کام کاج کر دیتا تھا، اینا نے سوچا، لیکن کام کرتے ہوئے وہ کبھی اتنا خوش نظر نہ آتا تھا۔

کارل کو وہاں، جھاڑو کے دستے کے سہارے، اس طرح کھڑے دیکھ کر جیسے کوئی دیانتدار خاکروب کسی راہ چلتے سے اطمینان سے گپ لڑانے کے لیے جھاڑو دیتے دیتے رک گیا ہو، اینا کا غصہ اور کراہت، اور اپنے آپ کو ایک بہروپیے کے سپرد کر دینے کی دہشت، دور ہو گئی۔

اینا کو صبح کے بوس و کنار کا خیال آیا، اور اس نے خود کو جس آدمی کے حوالے کیا تھا وہ رچرڈ ہی تھا، رچرڈ کے سوا کوئی نہ تھا۔ لیکن یہ مرد جو جھاڑو پر جھکا ہوا کھڑا تھا، رچرڈ نہ تھا۔ کارل اور اس کے شوہر کے درمیان، ماضی اور مستقبل کے درمیان، جو حد فاصل تھی وہ واضح اور اٹل تھی۔

اینا نے رچرڈ کو سالہا سال سے اتنے واضح طور پر نہ دیکھا تھا جتنا کہ اب دیکھ رہی تھی۔ وہ کارل سے بالکل مختلف تھا— زیادہ ٹھس، زیادہ سست— اور اس نے کبھی اس طرح کی باتیں نہ کی تھیں جیسی کارل کل کرتا رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ غالباً کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا، خواہ کوئی بھی ہو، جو گھاس کی پتی چبائے بغیر میدان میں لیٹا رہ سکتا ہو۔ رچرڈ تو خاموش طبع آدمی تھا، حوصلہ دلانے والا (اس کے رخساروں پر بالوں کی سیاہ کھونٹیاں ہمیشہ نظر آتی تھیں) اور محنت مزدوری کی وجہ سے تھوڑا اکڑا اکڑا۔ وہ اتنا جارحانہ نہیں تھا جتنا کہ یہ مرد تھا۔ یہ مرد تو ایسا تھا جیسے... جیسے کنڈلیوں والی کمانی۔ وہ تیز اور تند خو بھی ہوسکتا تھا؛ یہ بات اینا کو ابھی سے پتا چل گئی تھی۔

صبح کے واقعے نے اس ماضی کو جو اینا نے رچرڈ کے ساتھ بسر کیا تھا، اس طرح سامنے حاضر کردیا تھا کہ اس سے قبل کوئی چیز نہ کرسکی تھی۔ اور وہ ان کے درمیان کھڑا، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کررہا تھا۔

وہ اس قدر دیوانی، اس وقت بھی جب وہ بستر میں تھے، کیسے ہوسکتی ہے کہ ایک لمحے کے واسطے بھی یہ باور کرلیتی کہ یہ آدمی رچرڈ ہے؟ اس کا رچرڈ! اور اس کے باوجود، بہرحال، وہ اس کے ساتھ ہم بستر ہوچکی تھی۔ وہ بازو اسی مرد کے تھے، اسی کے بازو اور اسی کا منھ۔ اینا کے لیے وہ نہ تو عجیب تھا، اور نہ ناگوار۔ اب بھی نہیں تھا۔ عجیب بات۔ اور جو کچھ وہ کر گزری تھی اس کا خیال بھی اتنا برا نہ لگے گا، اس قدر خوفناک طور پر برا نہ لگے گا، اگر وہ بس اس بات پر مصر ہونا چھوڑ دے کہ وہ رچرڈ ہے۔

''تم وہاں کیا کررہے ہو؟ یہ کام تمھارے جوگا نہیں!''

''تم اس طرح کیوں بول رہی ہو؟''

اینا نے دفعتاً اس کی طرف سے رخ پھیرلیا۔ اینا کا منھ پھڑک رہا تھا۔ ''آئندہ سے کبھی نہ کہنا کہ تم میرے شوہر ہو! میری بات سن رہے ہو؟ آئندہ یہ کبھی نہ کہنا!'' اینا کی آنکھوں میں غصے کے مارے آنسو بھر آئے تھے۔

''مگر تم نے تو یہ بات آج صبح خود ہی کہی تھی۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ میں تمھارا شوہر ہوں۔ تم نے مجھے رچرڈ کہا تھا... ہم دونوں ایک دوسرے کے ہیں، تم اور میں!''

''ہم ہرگز ایک دوسرے کے نہیں ہیں۔ میں نے زندگی میں تمھیں پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ تم بس کل آئے ہو... میرا شوہر ممکن ہے ابھی زندہ ہو۔ یہ تو تم نے خود ہی کہا تھا۔ شاید وہ واپس آجائے۔''

''اچھا، اور پھر؟ اگر وہ واپس آجاتا ہے تو کیا؟ تمھارے خیال میں پھر کیا ہوگا؟'' ناگہانی وحشت کا رنگ تڑپ کر کارل کی آنکھوں میں اتر آیا، جو گہری اور بہت سیاہ ہوگئیں۔ وہ کھنچے کھنچے ہونٹوں سے بولا، لیکن زور سے نہیں: ''مجھے پروا نہیں کہ کون آتا ہے۔ یا کوئی آتا بھی ہے کہ نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہیں۔''

کارل کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کے چہرے کے خطوط میں نرمی آ گئی۔ ''یہ تقدیر ہے، اینا۔ یہ تقدیر ہے،'' اس نے دہرایا اور اس کی مسکراہٹ اور آواز میں دوبارہ تیقن کا گہرا سکون رچا ہوا تھا۔

کارل کی ناک بہت عمدگی سے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، بازو مضبوط اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔

اینا کو ہنسی آنے لگی: کارل اسے اتنا مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا کیوں کہ جوش میں آ کر وہ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا تھا اور خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اسے جھاڑو کے دستے سے چمٹنا پڑا تھا۔ ایک مرتبہ اور، کارل کے احساس کے زور شور اور فوری اثر نے ان تمام شکوک کو رفع دفع کر دیا جو اینا اس کی راست بازی کے بارے میں رکھتی تھی۔ کارل کی تند خوئی سے، جسے اس کا مضبوط ارادہ بے قابو نہ ہونے دیتا تھا، اینا کی خاکستری آنکھیں پھیلی کی پھیلی رہ گئیں۔

وہ کوئی خیال نہ تھا بلکہ طیش، تمرد اور میلان پر مشتمل ایک نوع کی جبلّت تھی جو اینا کو بتا رہی تھی کہ کارل شاید ماضی پر فتح پا لے، جسے اس نے خود ہی سامنے حاضر کیا تھا؛ شرط صرف یہ تھی کہ وہ اینا کے شوہر ہونے کے دعوے سے، بذاتِ خود ماضی بن جانے کے دعوے سے، دست بردار ہو جائے۔

نہیں، بات بہت بڑھ گئی ہے — وہ مجھ پر رعب جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ''مہمل!'' لاشعوری طور پر اینا نے اپنے خیال کو بلند آواز سے کہہ دیا۔ وہ گود میں ترکاری کی سینی رکھے کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی، اور اس کی انگلیاں پھرتی سے چھیلنے کاٹنے میں مصروف تھیں۔ اس نے پہلو بدلا، سینی کو تنک مزاجی سے کھسکایا، اور اپنی جھنجھلاہٹ گاجروں پر اتارنے لگی۔

کام کرتے وقت اینا نے ایک بے فکر، سرسری وضع اختیار کر لی تھی؛ اور اس کے باوجود وہ جس انداز سے اٹھی، اور اپنے پیش بند سے گاجروں کی چھیلن جھاڑ کر سینی کو گیس کے چولھے کی طرف لے گئی، حتیٰ کہ جس انداز سے اس نے اپنے کولھوں کو حرکت دی، وہ ان حرکات سے مختلف تھا جو اس سے تنہائی میں یا، اس مرد کی طرف سے بے پروا ہونے کی حالت میں، سرزد ہوتیں جو اس کے پیچھے صوفے پر بیٹھا تھا۔

وہ وہاں دبکا دبکایا، سر ہاتھوں میں پکڑے، ایسے عزائم سے بھرا بیٹھا ہوا تھا جنھیں جسمانی طاقت یا قوتِ ارادی کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہ تھا۔ وہ اچانک طیش میں آ کر اچھل کھڑا ہونے اور یہ مطالبہ کرنے والا ہی تھا: ''... اور اگر تم نہ مانو گی، میں دوبارہ سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔''

لیکن کارل کو پتا تھا کہ سفر کا کیا مطلب ہے؛ اس کی ہڈیوں میں سفر کی دھن ابھی تک تھی، اور وہ اپنی گزشتہ زندگی کی مفلوج کرنے والی تنہائی سے بھی واقف تھا۔

اس نے ایک مرتبہ رچرڈ سے کہا تھا، ''آدمی اپنے آپ سے پوچھتا رہتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ

کیوں کر برداشت کر سکتا ہے؛ پوچھتا رہتا ہے، اور اسے کوئی جواب نہیں ملتا، بالکل کوئی جواب نہیں ملتا۔ اس کیڑے کی طرح جسے تپتی ریت پر ایک لاکھ میل رینگنا ہو۔ یہی بات ہے— کیڑا جس کے نصیب میں مٹی نہ ہو! یہی میری زندگی ہے!''

اپنے مضبوط کردار اور رواں دواں توانائی کے باوجود، جو دس زندگیوں تک اس کے کام آ سکتی تھی، کارل کو کسی ایسی ہستی کی ضرورت تھی جس سے وہ چمٹا رہ سکے۔

وہ صوفے پر دبکا دبکایا بیٹھا رہا۔ اسے پتا تھا کہ اگر وہ چلا بھی گیا تو اگلے روز واپس آ جائے گا۔ اس کا اڑیل پن اور ارادے کی مضبوطی، جو اسے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے قابل بناتی تھی، اس جوشیلے غیظ و غضب کا گلا گھونٹنے کے لیے کافی ثابت ہوئی جو اس کے حلق اور گردن میں رہ رہ کر چڑھا چلا آ رہا تھا۔

اپنا سر موڑے بغیر اینا نے یکا یک کہا، ''جب میرے شوہر کی موت کی خبر آئی تھی تو میں نے اپنی سہیلی سے جو کچھ کہا تھا وہ بھی تمھیں، میرا قیاس ہے، لفظ بہ لفظ معلوم ہوگا؟ میرا قیاس ہے کہ تمھیں میری ایک ایک بات کی خبر ہے، کہ میں شادی سے پہلے، لڑکپن میں یا بالکل بچپن میں کیا کیا کرتی رہی ہوں؟'' اور غصے کے مارے وہ یہ اور بڑھانا چاہتی تھی: ''یا پیدا ہونے سے پہلے کیا کرتی رہتی تھی؟''

جس کا کارل نے آہستہ اور بوجھل پن سے یوں جواب دیا: ''نہیں مجھے خبر نہیں۔ مگر مجھے یہ پتا ہے کہ بچپن میں تم کس طرح کی تھیں۔ بہت زیادہ پیش پیش نہ رہتی تھیں؛ لیکن دوسرے بچوں کی طرح روانسی بھی نہ تھیں۔ جب تمھاری ماں تمھارے بالوں میں کنگھی پھیرتی تھی تو تم بے صبری کا اظہار نہ کرتی تھیں۔ تمھیں پتا تھا کہ انتظار کس طرح کیا جاتا ہے، اور تم بشاش رہا کرتی تھیں، گو تمھیں بشاشت کا احساس نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک سیب کی مانند پکی تھیں، جو بس بڑا، اور بڑا ہی ہوتا جاتا ہے۔''

یہ کہنے کے بعد ہی کارل نے ہاتھوں پر سے اپنا سر اٹھایا۔ ''مجھے ہمیشہ کسی چیز کی آرزو رہی ہے۔ غالباً تمھیں کبھی پتا نہ چل سکا کہ آرزو کا کیا مطلب ہے، اور شاید تمھیں اب بھی پتا نہیں۔''

یوں یہ ماجرا پیش آیا کہ کسی اور کے تخیل کی مدد سے، جسے محبت نے بصیرت کے تحفے سے نوازا تھا، اینا نے زندگی میں پہلی بار اپنا بچپن اور جوانی دیکھی اور پرسوز جذبے کے ساتھ یہ تجربہ حاصل کیا۔

کارل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اینا کے ہاتھ ساکت ہو گئے تھے۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اینا نے گہرے طور پر متاثر ہو کر دریافت کیا۔

میرے احساسات کی جیسی حالت ہے، کارل نے سوچا، اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا کہ وہ یا تو مجھ سے محبت کرتی ہے یا پھر بات کو ختم سمجھنا چاہیے۔

''جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ خبر— غلط خبر— ملنے پر تم نے اپنی سہیلی سے کیا کہا تھا، تو

وہ تمھیں ضرور سخت تکلیف دہ معلوم ہوئی ہوگی، جیسی کہ ہر عورت کو معلوم ہوتی ہے۔ اس سے دل چھلنی ہو جاتا ہے... لیکن میں تم سے واقف ہوں؛ تمھیں یقین نہ آسکا کہ یہ حادثہ تمھارے ساتھ پیش آیا ہے، یا کسی طرح پیش آ بھی سکتا ہے۔ تم تو لنڈن (۱) کے پتے جیسی ہو— اور تم دیکھنے میں بھی ویسی ہی ہو! تم نے اس خبر پر یقین کیا بھی تو شاید سچ مچ یقین نہ کیا۔ اور پھر تم پر بھی وہ وقت آگیا جب بس روز بروز جیے جانے کے سوا تمھارے لیے چارہ نہ رہا، اور یہ جینا کسی چیز کے لیے نہ تھا؛ بالکل کسی چیز کے لیے نہ تھا۔ تم کسی کے لیے آرزومند رہتی ہو، آرزومند رہتی ہو۔ میں اس آزمائش سے گزر چکا ہوں... تم گزری ہو؟ کیا تم اس آزمائش سے گزری ہو؟"

اینا کو رچرڈ کی طرف سے کبھی غیر مطمئن ہونے کا احساس نہ ہوا تھا۔ اس نے کبھی یہ محسوس نہ کیا تھا کہ اسے غلط سمجھا گیا ہے؛ نہ اسے کبھی یہ خیال آیا تھا کہ رچرڈ اس سے واقف ہے۔ وہ روزمرہ کے تفکرات کے سوا کبھی کسی چیز کی بات نہ کرتے تھے۔ اب بھی اس نے دونوں مردوں کا موازنہ نہ کیا۔ وہ وہاں شرم سے سن کھڑی رہی کیوں کہ اس نے اس آدمی کو بہروپیا تصور کیا تھا۔

کئی مرتبہ کسی لفظ سے، اچٹتی ہوئی نظر سے، آواز کے سُر سے، کارل نے اینا کے اندر کسی ایسی چیز کو للکارا تھا جو افتادہ پڑی ہوئی تھی۔ اینا کو کل رات سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر عریض، نایافتہ خطے موجود ہیں۔ چند منٹ کے لیے وہ ایک لطیف اور سراسر انوکھے ہیجان میں مبتلا رہی۔ لیکن وہ بالطبع آہستہ رو تھی۔ وہ یکا یک جست وخیز کر کے آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔ وہ جینے میں، سانس لینے میں، عمل میں، کھری تھی، اپنے آپ سے سچی تھی۔ رچرڈ کے ساتھ گزرے ہوئے ماضی سے اس کی ذات کا، حال میں اس کے وجود کا، رشتہ اچانک کٹ گیا تھا، کہ زیادہ دیر زندہ رہنے میں وہ اس ماضی سے، جو زرد ہو کر اس کے پیچھے ڈوب چکا تھا، بازی لے گئی تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، کارل کو یہ سبق سیکھنا پڑا کہ وفاداری شاید منتظر رہنے کے سوا کچھ نہ ہو۔

اینا، ماضی کی اس زندگی کے ہاتھوں اچانک گھائل ہو کر جو کسی بیگانی اور بیرونی چیز کی طرح اس کے اندر بالجبر دوبارہ داخل کر دی گئی تھی، کارل کی پیش قدمیوں کو مسترد کرنے پر مجبور ہوگئی گو، مجبوری کی اوٹ میں، کارل کے سامنے جھک جانے کی خواہش پروان چڑھ رہی تھی اور حیات پرور تھی۔

رچرڈ ہونے کا دعویٰ کر کے کارل نے ماضی کو وہ جیتی جاگتی توانائی بخش دی تھی جو بچپن کی یادوں میں پائی جاتی ہے، لیکن اس کے احساسات کے مدنظر باقی سب کچھ ایک جھوٹ ہوتا۔ وہ عورت جو کسی زمانے میں ایک اور مرد کے ساتھ رہتی تھی، اس کی اینا نہ تھی۔ وہ، اور صرف وہ، ابتدا سے اس سے وابستہ چلا

---

(۱) Linden

آ رہا تھا۔ اس کے لیے اس کا جھوٹ سچائی، اور حقیقت فریب نظر تھی۔

ہر شام جب وہ کام تلاش کرنے کی مہم سے واپس آتا تو اس سدِ راہ کے روبرو لاچار کھڑا ہو جاتا جو خود اس نے تعمیر کی تھی اور جسے وہ اپنے احساس کو مجروح کیے بغیر سامنے سے ہٹا نہ سکتا تھا۔ وہ ایک ایسی سطح پر پہنچ گئے تھے جہاں زندگی کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا، جہاں احساس کا ہر تبادلہ، ہر پیار اور آویزش، تمام جسمانی اتصال ناممکن تھا۔

ان ہفتوں کے دوران میں اینا نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ محتاط ہو کر اور خفیہ طور پر گھر سے نکلا اور واپس آیا کرے۔ کسی کو یہ پتا لگانے کا موقع نہ دیا گیا کہ وہ اس کے کمرے میں سوتا ہے۔

۴

اینا کی سہیلی، میری، اپنی بہن کے ساتھ، چوتھی منزل کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔ کمرے کا رخ تینوں صحنوں میں سے اس صحن کی طرف تھا جو دوسرے نمبر پر تھا۔ کمرے کی اور تنگ آہنی پلنگ کی لمبائی بالکل برابر تھی جس نے اندرونی دیوار اور کھڑکی کے درمیان کہیں انچ بھر جگہ بھی خالی نہ چھوڑی تھی۔

کھڑکی کے پاس کمرہ قدرے چوڑا ہو گیا تھا۔ وہاں تین بلدار پایوں اور ایک ہاتھ منھ دھونے کے طشت پر مشتمل لوہے کا ڈھانچ رکھا تھا۔ میز یا کرسی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ جب میری صبح کو منھ دھوتی تو اسے پلنگ پر گھٹنوں کے بل جھکے جھکے اپنا چہرہ پانی میں ڈبونا پڑتا۔

ایک اتوار کی سہ پہر کو اینا پلنگ کی پائنتی پر بیٹھی ہوئی تھی اور میری پلنگ پر ننگی کھڑی چہل قدمی کے لیے کپڑے پہننے کی تیاری کر رہی تھی۔

دروازے کے ساتھ والے نسبتاً بڑے کمرے میں وہ آدمی جو میری کی بہن — جس کا شوہر محاذ جنگ پر تھا — کے ساتھ رہتا تھا، زنگ جیسے کتھئی رنگ کے صوفے پر پڑا سو رہا تھا۔ بہن کے دونوں بیٹے، عمر آٹھ اور نو سال، ایک پرانی بچہ گاڑی کے سامنے سوچ میں ڈوبے کھڑے تھے۔ گاڑی میں ان کا چھ ماہ کا بھائی — سوئے ہوئے آدمی کا بیٹا — اپنے کلّوں میں دونوں ننھی منی مٹھیاں ٹھونسے لیٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ سہ پہر بھر کے لیے ٹھیلا کہاں سے بہم پہنچائیں۔

"ہم بس اس کا دھڑا تار کر الگ کیے دیتے ہیں،" بڑے لڑکے نے کہا، جس کے ہاتھ میں پیچ کش تھا: "پھر ہم اس کا ڈھچر کام میں لا سکتے ہیں۔"

"لیکن چپ چاپ کام کرنا ورنہ وہ چیخم دھاڑ شروع کر دے گا۔"

انھوں نے آٹھوں پیچ کھولے، اور گاڑی کے اوپری حصے کو، جس میں لیٹا ہوا شیر خوار بچہ جاگ اٹھا

تھا، اٹھا کر فرش پر رکھ دیا، اور فریم ورک اور پہیے لے کر کمرے سے کھسک گئے۔ ''ہم اوپر کا دھڑ آج رات پھر پہیوں پر کس دیں گے... لو، وہ رونا چلانا شروع کر رہا ہے۔''

آدمی بھی جاگ اٹھا— وہ موٹروں کا مستری تھا— اور اس نے فوراً مڑ کر بچہ گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ جگہ جہاں بچہ گاڑی کھڑی ہوئی تھی خالی پڑی تھی۔ اس کے باوجود، اس میں ذرا بھی شک نہ تھا، ایک بچہ کمرے میں رو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور، ہکا بکا اور نیم بیدار ہو کر، نیچے اپنے بیٹے کو تکنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ مسکراتا ہوا اسے گود میں لیے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

یہ خود بخود پیش آ گیا تھا، حالات کا نتیجہ تھا۔ اس آدمی نے سونے کے لیے کچھ جگہ کرائے پر لی تھی — اس شوہر کا پلنگ جو محاذ جنگ پر تھا۔ پہلے پہل دونوں پلنگوں کے درمیان میز، سرحد کے طور پر، حائل رہی: پہلے ہفتے کے دوران میں، جب وہ سونے کے لیے لیٹتے تھے تو بجلی گل کر دی جاتی تھی۔ اس روپے سے جو مستری کو سستے ہوٹلوں میں گھٹیا کھانے پر اٹھانا پڑتا، عورت سارے کنبے کا، جسے بغیر کسی آمدنی کے چھوڑ دیا گیا تھا، پیٹ پال رہی تھی۔ دونوں پلنگ دوبارہ ساتھ ساتھ بچھ گئے۔

عورت دروازے میں نمودار ہوئی؛ اس کا پیش بند دھونے دھلانے کے کام میں بھیگ گیا تھا اور ہاتھ میں مانجھنے کا برش تھا۔ ''کیا یہ روتا رہا ہے؟'' اس کا چہرہ خاکستری تھا، کھال لٹکی ہوئی تھی، لیکن اس کے سرخ کٹھئی ہونٹ چکنے اور بھرے بھرے اور خون آگیں تھے اور، واہونے کی وجہ سے، اس کی چوڑی کھلی ہوئی سوالیہ آنکھوں سے میل کھا رہے تھے۔ وہ موٹر مستری سے عمر میں بڑی تھی۔

''وہ دیکھو!'' وہ چیخا، اس کا چہرہ دوبارہ چمک اٹھا، اور اشارہ کرنے لگا۔

''تو یہ تھی وہ بات جس کے متعلق دونوں شیطان رات بستر میں لیٹے گفتگو کر رہے تھے۔'' اس نے بچے کو چھاتی دی جو حیرت انگیز طور پر نوجوان عورتوں جیسی تھی۔ چھاتی کا رنگ سفید تھا، اس میں آسمانی رگیں تھیں اور وہ زیادہ بڑی نہ تھی۔

مستری، پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا، بڑی گہری توجہ سے اپنے بیٹے کے چوستے ہوئے ہونٹ دیکھتا اور حریصانہ غٹاغٹ سنتا رہا۔

چند دن کے اندر اندر شوہر کے چھٹی پر گھر آنے کی توقع تھی۔

ساتھ والا چھوٹا کمرہ میری کی ہنسی سے گونج اٹھا۔ وہ ابھی تک پلنگ پر کھڑی تھی اور اینا کی مدد اور نکتہ چینی سے ایک چھوٹی کرتی پہن کر دیکھ رہی تھی جو اس نے خود اسی صبح سی کر تیار کی تھی۔

کھڑے کھڑے اس نے اپنی جراب پہنی۔ اس کی ٹانگ، چھوٹے سے پاؤں سے گھٹنے تک، نازک، لڑکیوں جیسی اور خوبصورت تھی۔ گیٹس کے گہرے نشان کے اوپر سے عورت شروع ہوتی تھی: جسم نرم،

اونچی نیچی گولائیوں میں باہر کی طرف ابھرتا ہوا؛ جلد سیاہی مائل دھبے لیے اور کہیں کہیں کھردری۔

اس کے جانگیے کے پائنچے مشینی کشیدہ کاری کے بھدی وضع کے کھلے کام سے مزین تھے، اور جانگیے کی ڈوری اس کی کمر میں دھنس گئی تھی؛ اور ڈوری کے فوراً بعد اور اوپر کسی بچی کی سی چھریری، بے حد نازک، ناتجربہ کار پیٹھ تھی۔

اینا نے اسے ایک سوتی فراک تھمائی جس پر نیلی بُندکیاں تھیں۔ فراک میں سر اور بازو غائب ہو جانے کے بعد بھی وہ اینا کو وہ تمام واقعات سناتی رہی جو ان کی آخری ملاقات کے بعد سے اب تک اس رہائشی بلڈنگ میں پیش آئے تھے۔

پہلے اس کی چھوٹی چھوٹی، پھیلی ہوئی انگلیاں نمودار ہوئیں، جن کے ناخن چھوٹے اور چوڑے تھے، پھر مضبوط، بہت چھوٹا سر، چہرہ، جس کا یکسانیت لیے پُرحرارت ہلکا رنگ ایسا تھا جیسا کسی نادر لکڑی کا ہوتا ہے۔ عمدہ آنکھیں اور بھنویں اور خمیدہ پلکیں اس کے خوشبودار، بھورے بالوں سے زیادہ گہرے رنگ کی تھیں۔ اس کے گالوں کی چست چکنی سطح پر ننھے ننھے گڑھے پڑتے اور مٹتے رہتے تھے؛ وہ اس کے چھوٹے سے منھ کا اشارہ پاتے ہی، جیتی جاگتی دلفریبی کے ساتھ، رخساروں پر نمودار ہو جاتے تھے۔

وہ، جسم اکڑا کر، اپنی مرضی سے پیچھے کو چاروں خانے چت گری اور گدے کے اچھلتے ہی، شگفتہ مزاجی کے فرط سے، پہلو کے بل لیٹ گئی۔ اپنا سر اینا کی گود میں رکھ دیا۔ اینا نے لڑکی کے دہکتے ہوے رخساروں کے گرد ہاتھ باندھ لیے۔

فرشی منزل کے کسی مکان میں کوئی اپنے طاقتور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیخنے لگا۔ شور دیواروں سے ٹکرایا، تنگ صحن میں گونجتا ہوا اوپر لپکا اور چوتھی منزل میں کھڑکیوں کو چھوتا ہوا، آسمان کی طرف بلند ہو گیا۔ ایک اور واویلا، جو دم بھر کے لیے سنائی دیا۔ پھر ایک عورت کی تیز، باریک آواز، بلند ہوتی ہوئی۔

''لو، وہ پھر اسے مار رہا ہے۔'' میری چونک اٹھی تھی۔ ''یہ روز لڑتے جھگڑتے ہیں اور پھر بھی علیحدہ ہونے کا نام نہیں لیتے۔''

جس عورت کی ٹھکائی ہو رہی تھی اس نے، اپنے شوہر کے جنگ پر چلے جانے کے بعد، ایک اور آدمی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ بہت سی عورتوں نے یہی کیا تھا، اور ان میں سے کوئی اپنا راز چھپا نہ سکی تھی۔ اس نفرت اور نکبت کا، بیماری اور احساسِ جرم کا، اس تکلیف کا جو بے قصور سہنی پڑ رہی تھی اور ساتھ ہی خلوص اور محبت آمیز خبرگیری کا، جس سے وہ بلڈنگ بھری ہوئی تھی، میری گھنٹوں تذکرہ کر سکتی تھی۔

میرے ساتھ بھی بالکل یہی پیش آئے گا، اینا نے سوچا؛ تم ایک اور مرد کے ساتھ رہنے لگتی ہو، کیوں کہ تمھارا شوہر یہاں نہیں ہے یا تمھیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ یہ تو روز ہوتا رہتا ہے۔

دوسری منزل پر کارل، اس قیدی کی طرح بے حرکت جو یہ سیکھ رہا ہو کہ انتظار کیسے کیا جاتا ہے، بند کھڑکی کے پیچھے کھڑا تھا۔

''اور جب تمھارا میاں گھر آئے گا اور دیکھے گا کہ ہم کیا کرتے رہے ہیں تو، فرض کرو اس نے سب کچھ توڑ پھوڑ ہی ڈالا!'' موٹر مستری نے ساتھ والے کمرے میں کہا۔

صحن کے ایک گوشے میں لوگ جمع ہو گئے تھے: زرد رُو اور مدقوق، نیم برہنہ بچے، چیتھڑوں میں لپٹی عورتیں، صرف قمیص اور پتلون پہنے ہوئے مرد۔ نیلے نیلے چہرے۔ وہ ایک بھوک سے نیم جان بوڑھے کو، جسے غشی کا دورہ پڑ گیا تھا، اٹھا کر تازہ ہوا میں لائے تھے۔

ایک شہ زور نوجوان مزدور صحن کے بیچ میں، اپنا جسم تقریباً زاویہ قائمہ میں پیچھے کو جھکائے ہوئے، تیرانداز کی وضع بنائے کھڑا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے اپنی کمان چڑھائی، جو پتلے، چپٹے فولاد کا پانچ فٹ لمبا اور تقریباً سیدھا ٹکڑا تھا، اور وہ تن کر نیم دائرہ بن گئی۔ نکل شدہ فولاد کی نلکی کا بنا ہوا لمبا تیر، نرسل کی طرح پتلا، زن زن کرتا، گرمیوں کے آسمان کی آزادی میں عموداً چڑھتا گیا، دھیرے سے چمچماتا ہوا مڑا، اور تنگ، اندھیرے صحن میں واپس آ گرا؛ مضبوط، متزلزل ہاتھوں میں ایک پُر خطر حربہ، جو ممکن ہے گرتے گرتے تیرانداز ہی کو گھائل کر دے۔

اس نے بار بار تیر چلایا۔ کونے میں گھسے کھڑے ہوئے سب لوگ اوپر دیکھتے رہے: ایک دھندلی، سایہ آسا ٹولی۔ وہ بوڑھا بھی اوپر دیکھنے لگا جو بھوک سے نیم جان تھا۔

سائیکل کی گھنٹی نے ایلفی کو کھڑکی میں طلب کیا۔ ''فراؤ اینا کے پاس کوئی ملاقاتی ہے۔ وہ وہاں نیچے کھڑا ہے... ڈنر مزے کا تھا؟''

''ہاں، گاجریں۔''

''اوہ، گاجریں؟''

تھوڑی دیر بعد وہ، اپنے رنگین بھاری جوڑے زیب تن کیے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس سڑک پر اٹھلاتی چلی جا رہی تھیں جس سے ہفتوں پہلے کارل تھکے تھکے قدم اٹھاتا آیا تھا؛ دونوں کی لمبی لمبی ٹانگیں تھیں، چھڑیوں جیسی پتلی، اور پنڈلیاں تھیں ہی نہیں، اور انھوں نے بالوں میں بھدّے تیز سبز رنگ کے ربن باندھ رکھے تھے: دودھو بن چڑیاں۔

میری نے بھی نیچے نظر ڈالی تھی۔ کارل اب بھی کھڑکی کے پاس بے حرکت کھڑا تھا۔ ''میں نے کہا، تمھارا ملاقاتی کون ہے... بتاؤ، کون ہے وہ؟''

اینا کی خاموشی طویل ہو کر اعتراف میں تبدیل ہو گئی۔ وہ سنجیدہ اور مضطرب تھی۔ اور یوں وہ کمرے

سے رخصت ہوئی۔

جب وہ نیچے پہنچے گی تو وہاں کوئی موجود ہوگا— کوئی محض اتفاقی ملاقاتی نہیں۔ ایسی ساعت، جیسی اس پہلی صبح کو ان کے حصے میں آئی تھی، لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کردیتی ہے۔ بہت قریب۔ انھیں ایک دوسرے سے وابستہ کردیتی ہے۔ جب وہ اندر جائے گی تو وہاں کوئی موجود ہوگا، اور یہ بات خوش آئند ہے۔ کمرہ اتنا... اتنا باقرینہ اور خالی خالی نظر نہ آئے گا جتنا کہ آیا کرتا تھا... کیا اس کا شوہر ابھی زندہ ہے؟ اسے دعویٰ تھا، اور اس طرح سے کہ آدمی یقین لانے پر تقریباً مجبور ہوجاتا تھا، کہ وہ اس کا شوہر ہی تھا۔ اینا کو لازماً یہ عادت، یہ احمقانہ عادت، اس سے چھڑانی پڑے گی۔ اینا اسے یہ عادت ترک کرنے پر ضرور مجبور کرے گی۔ وہ اسے جھانسا دے کررہے گی۔

ہاں، لیکن فرض کرو کہ اس کا شوہر ابھی زندہ ہے— پھر کیا ہوگا؟ اگر وہ ابھی تک زندہ ہو تو؟... پھر تو ساری بات ناممکن ہوجائے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی عورت بغیر کچھ کہے سنے اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور کسی دوسرے مرد کے پاس چلی جائے۔ یہ بات اتنی آسان نہیں تھی کہ بس... رچرڈ کی آنکھیں اور وہ انداز جس سے وہ اینا کو دیکھا کرتا تھا، صرف اتنی یاد ہی اینا کے لیے بہت تھی۔ اور رچرڈ کا بڑا سا دیانتدار ہاتھ— ہاں، اور وہ مکمل اعتماد جو اینا کو رچرڈ پر تھا— رچرڈ کی رفاقت میں وہ محفوظ اور مامون رہ چکی تھی۔ یہ سچ تھا۔ محفوظ، قطعی محفوظ!

''ہم سیر کرنے جاسکتے ہیں، اگر تم پسند کرو۔''

''ہاں،'' کارل نے آہستہ سے کہا اور اپنے کپڑوں کو دیکھنے لگا۔

''تم اگر پسند کرو تو میرے میاں کے سفید کالروں میں سے کوئی کالر لگا سکتے ہو۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں!''

صرف میری ضرورت ہے اسے۔ وہ رچرڈ سے میرے سوا کچھ نہ لے گا۔ ''تم کہتے ہو وہ ابھی زندہ ہے، اور اس کے باوجود چاہتے ہو کہ میں تمھاری بیوی بن جاؤں!''

''اس بات سے میرے لیے کوئی فرق نہ پڑے گا،'' کارل نے قہر آلود نظر ڈال کر کہا۔ اور پھر اچانک، کوئی تمہید باندھے بغیر، اور ایسے لہجے میں جس سے وہ جان گئی کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں اس بارے میں سوچتا رہا ہے اور اس بات کو کہہ دینے کا تہیہ کرچکا ہے، کہا، ''جس دست فروش نے ہمیں وہ پردے خریدنے کی صلاح دی تھی اس کی بہت چھوٹی، سیاہ مونچھیں تھیں۔ بس اتنی بڑی بڑی! اور اگر تم جاننا چاہتی ہو، اس کے ماتھے پر دو پھنسیاں تھیں۔ وہ پھنسیاں اس وقت میں نے ہی تمھیں دکھائی تھیں۔''

غصیلی بے صبری کی ایک لہر اینا کے جسم میں دوڑ گئی۔ ''مجھے نہیں پتا یہ باتیں کہاں سے تمھارے

ہاتھ آ گئیں۔ میں تم سے خفا ہوں! یہ نفرت انگیز ہے، جو کچھ تم کر رہے ہو— نفرت انگیز!''

کارل کا چہرہ ایک یاس آلود بے طاقتی کے مارے اینٹھ گیا، ایسی بے طاقتی جسے مرد صرف اس وقت محسوس کرتا ہے جب اس کے ساتھ سنگین ترین زیادتی کی گئی ہو۔

ان دونوں کو دیکھتے ہی بہت سے راہ چلتوں کے چہروں میں، جو اپنی اتوار کی سہ پہر کی بے مزہ چہل قدمی سے پژمردہ نظر آ رہے تھے، چند لمحوں کے لیے جان پڑ گئی: اینا اتنی طرحدار، اتنی دھیمی اور مضبوط، اپنے اونچے کولھوں سے اتنے پھرتیلے ڈگ بھرتی ہوئی، اور اس کے پہلو میں، تاریک رُو، ژولیدہ حال مرد، بغیر کالر کے، جو اس طرح دہک رہا تھا جیسے راکھ کی مہین تہہ کے نیچے روشن انگارہ دہکتا ہے۔

وہ ٹہلتے ہوئے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ پہلی مرتبہ وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے تھے۔ اس کے لیے یہ کیسی تکمیل آرزو تھی جو اینا تک پہنچنے کی خاطر تین مہینے پیادہ پا جنگلوں میں چلتا اور سرحدیں پار کرتا رہا تھا! اب وہ اس کے ساتھ ساتھ ٹہل رہا تھا۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کس طرح چلتی ہے، کارل چند قدم پیچھے ہو گیا، اور اینا کی وہ تصویر جو اس نے دور افتادہ لق و دق میدان میں چشم تصور میں دیکھی تھی، اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ اس وقت وہ چکنے، بھورے سے رنگ کے چست لباس میں اس کے سامنے ظاہر ہوئی تھی، جیسے کوئی مردہ عورت، درختوں کے نیچے ایک جانی پہچانی پگڈنڈی پر بغیر کسی مادی جسم کے بھٹکتی بھٹکتی، اپنے محبوب کے پاس واپس جا رہی ہو۔ اپنے احساس کی فوری یورش کے سامنے کارل کا رنگ اڑ گیا۔

اگر ضرورت پڑی تو میں برسوں انتظار کرتا رہوں گا، اس نے سوچا، اور منٹ بھر انتظار کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔

جب اینا، چہرے پر بھولی بھالی دانش مندی لیے اور نگاہوں میں دانش مندانہ اعتدال اور باطنی تموّل سموئے، کارل کی طرف مڑی تو یکا یک یہ آسمان جیسا نیلا احساس اس پر طاری ہو گیا کہ وہ بالکل ایسی ہی جذباتی کیفیت میں ایک دفعہ پہلے بھی کارل کی طرف مڑ چکی ہے۔ ''کیا یہ ممکن ہے—''

کارل نے اس کی بات کا مطلب بھانپ لیا، کیوں کہ اس کی قوتِ ارادی اور جذبات اسی نقطے کے گرد دُر کے بغیر گھومتے رہتے تھے۔ ''ایسا ہی ہے...''

''کہ میں تمھارے ساتھ یہاں پہلے بھی آ چکی ہوں؟''

وہ مڑ کر دو رویہ درختوں والی ایک سڑک پر پہنچے جو مضافات کو شہر سے ملاتی تھی: وہی سڑک جو کارل نے کبھی چشم تصور میں دیکھی تھی۔ ''تم ایک دفعہ پہلے بھی یہاں موجود تھیں، درختوں کے نیچے: شام کا وقت تھا اور تم میرا انتظار کر رہی تھیں۔''

یہ بات رچرڈ نے اسے کبھی نہ بتائی تھی، لیکن اسے پتا تھا کہ یہ سچ ہے۔ اس نے اینا کو ٹہلتے اور انتظار کرتے دیکھا تھا، سچائی اس کے اندر موجود تھی، اور اس نے سچ بول دیا تھا۔

اینا کو اپنے بائیں پہلو میں، جو کارل سے ملا ہوا تھا، سرتاسر ایک پگھلتی ہوئی گرمی اترتی محسوس ہوئی۔ حقیقت، اپنی تمام تر رکاوٹوں کے ساتھ، غائب ہوگئی۔ سب سے باطنی احساسات دفعتاً لہلہا اٹھے۔ ان کے دلوں کے دھارے ساتھ بہنے لگے۔

اینا نے سوچ بچار نہ کیا۔ اس نے جو محسوس کیا اسی پر یقین لے آئی۔ اور آخری مٹھاس کو چکھنے کی خاطر، اسے اپنے احساس کو الفاظ کی شکل دیتے ہی بنی، وہ نام لینا ہی پڑا۔ اور اس نے وہ نام لیا: ''رچرڈ''۔

کارل نے طلسمی دائرے کو مکمل کر دیا؛ اس نے صرف یہ کہا: ''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' یوں وہ چلتے گئے۔

''اور بچہ؟ کیا اب تم بچے کی ماں بننا چاہتی ہو؟ کیا اب تم ایک بچے کی ماں بننا چاہتی ہو؟''

جب اینا کے ہونٹ کارل کے لیے وا ہوئے تو پپوٹے ڈھلک کر مند گئے۔ اس کے باوجود وہ ایسی عورت تھی جو دیر میں اثر قبول کرتی تھی۔

اینا کے ہونٹوں سے ہونٹ بھڑا کر کارل نے دوبارہ سوال کیا۔ اینا کے ناگفتہ جواب کا گہرا اطمینان دل میں لیے وہ اپنی دراز قامت بیوی کے ہمراہ سرائے کے باغ میں داخل ہوا۔

کیا وہ، بچپن میں، ایک دفعہ پہلے یہاں نہ آیا تھا؟ اور سرائے والے کی بیٹی، ہاں، اینا نے، اس کے گلے میں بانہہ ڈال کر، دودھ بھرا گلاس اس کی طرف کھسکا دیا تھا۔

باغ کے ایک تقریباً سنسان کونے میں درخت کے نیچے بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے انھوں نے خود کو ایک دوسرے سے بے حد قریب محسوس کیا، جیسے کہ زندگی نے اینا اور رچرڈ کو کبھی یکجا نہ کیا ہو، جیسے کہ اتفاق، جس کی سرگرمیوں کا لاکھوں میں شمار ہوتا ہے، جو زندگی پر محیط غلطیوں کے لیے در وا کرتا ہے اور پوری تقدیروں کا فیصلہ کر ڈالتا ہے، ان دو دلوں کی تمنا اور طاقت کے ہاتھوں بالکل ہی زیر ہو گیا ہو، وہ دل جو، تازہ دم اور قوی، ایک دوسرے کی دھڑکن کو یوں دھیان سے سن رہے تھے گویا شروع سے اسی طرح سنتے چلے آئے ہوں۔

ساتھ والی میز پر ایک کاریگر کا کنبہ آ بیٹھا۔ بیٹھنے سے پہلے عورت نے جلدی جلدی ان سینڈوچوں کو پیکنگ سے نکالا جو وہ ساتھ لائی تھی، اور چاروں بچے، جن کی ناکیں میز کے کنارے سے بس ذرا ہی اونچی تھیں، ان ندیدے چینگی پوٹوں کی طرح راڑ مچانے لگے جو چڑیا کو گھونسلے کی گگر پر اترتے دیکھتے ہی بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اور یوں باہر کی دنیا از سر نو جی اٹھی۔

اینا نے دوبارہ سوچنا شروع کیا۔ لیکن وہ قسمت جو ہزاروں میں سے ایک کے حصے میں آیا کرتی

ہے، اس کے حصے میں آگئی تھی: اسے محبت ہوگئی تھی۔ وہ اس مطلق العنان احتیاط کے بس میں تھی، جس کے ماخذ کا سراغ نہیں ملتا، جو محبوب کے خصوصی اوصاف، کردار، حلیے، حالات سے بے تعلق ہے؛ جو موجود ہوتی ہے یا موجود نہیں ہوتی؛ جو سیسے کی طرح بھاری اور بو کی طرح غیر مادی ہے؛ جو ایٹم سے بھی چھوٹی اور کرۂ ارض جتنی بڑی ہے؛ جو انسان کو اوپر اٹھا کر روحانی مسرت سے ہم کنار ہونے کا موقع دیتی ہے یا نیچے گرا کر ایسی فلاکت کا نشانہ بناتی ہے کہ اسے چوہے پر بھی رشک آنے لگتا ہے۔ یہ ناقابلِ فہم اسرار اینا کے اندر کھل گیا تھا۔

برنجی سازوں والا بینڈ آٹھ بجے بجنا شروع ہوا۔ باغ پہلے ہی لوگوں سے بھر چکا تھا۔ مستقل آنے والے وقت کے پابند تھے۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی سرسری نظروں کو کارل نے محسوس کیا، لیکن اینا اور اس کا تعلق عمیق اور باہمی ہمدردی کی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ کارل تمام ابتدائی منزلوں سے، حتیٰ کہ اس منزل سے بھی جس میں ایک دل پسند عورت کے ساتھ دیکھے جانے پر غرور محسوس ہوتا ہے، گزر گیا تھا۔ باہر کی دنیا کی تمام جلوہ گری اب انھیں متاثر نہ کرسکتی تھی۔ زندگی کے شور شرابے میں گھرے ہوئے وہ، ایک دوسرے کے خلاف اور ایک دوسرے کے لیے، ایسی جنگ میں محو تھے جس میں نگاہوں سے زخم لگائے اور پھر نگاہوں سے ہی مندمل کیے جاتے ہیں۔

ایک پستہ قد بوڑھا، پیرانہ سالی کے ہاتھوں دہرا، اپنے غباروں کے سرخ، نیلے اور سبز بادل کے سائے میں، کسی زیپلن کے نیچے لگے ہوئے چھوٹے، سیاہ ڈبے کی مانند، ایک میز سے دوسری میز تک گویا بہا جا رہا تھا۔

وہ دورویہ درختوں والی سڑک کے راستے واپس ہوئے، جہاں ان کا تھوڑی دیر پہلے کا تجربہ ابھی تک گھات میں پھر رہا تھا۔ دونوں اس کے بارے میں سوچتے رہے۔ وہ آہستہ آہستہ اور چپ چاپ چلتے گئے: دو ہستیاں جو ایک دوسرے سے وابستہ تھیں۔

اینا نے مزاحمت کی۔ اس معاملے نے بہت تیزی سے اسے آلیا تھا، اور ابھی تک کوئی بات صاف نہ ہوئی تھی۔ یہ ابہام اینا کو ناگوار تھا۔ لیکن اچانک پچھلی تمام باتوں کو مٹا دینے اور ہر معاملے میں کارل پر یقین کر لینے پر آمادگی نے، جو عارضی لیکن جوشیلی تھی، ناقابلِ تعرض اور چبھتے ہوئے زور شور کے ساتھ اس پر ہلّا بول دیا۔

جب وہ بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو دونوں دھوبن چڑیوں نے سر جوڑے اور کھسر پھسر کی۔ ان کے چہرے اور بازو دھوپ سے سنولا گئے تھے۔ ایلفی نے اب زرد اور ایلما نے نیلا فراک پہن رکھا تھا۔ انھوں نے جھیل کے کنارے فراک بدل لیے تھے۔

''تم خوش قسمت عورت ہو، فراؤ اینا؛ میں تمھیں مبارک باد دیے بغیر نہیں رہ سکتا،'' ایک آدمی نے زینے پر کہا اور نیچے اترنے لگا۔ ''یہ کبھی کبھار ہوتا ہے کہ ایسا آدمی جس کے متعلق یہ خبر ملی ہو کہ وہ مر چکا، گھر لوٹ آئے۔ لیکن یہ خاصا شاذ ہے۔''

''ہم نے اس بارے میں کل رات خبر سنی تھی،'' ایلفی زور سے چیخی۔

''کس سے؟'' آدمی نے پوچھا، جواب ایک منزل نیچے پہنچ چکا تھا اور اینا نے یہ جواب سنا: ''فراؤ بوش سے۔''

فراؤ بوش ایک بوڑھی عورت تھی جسے بلڈنگ میں ہونے والی ہر بات کی خبر رہتی تھی اور وہ اس سلسلے میں ہر کسی سے، جو باتیں سننے پر آمادہ ہو، گپیں ہانکا کرتی تھی۔

اور اب کیا؟ اینا نے سوچا۔ اور یکا یک وہ اپنی سہیلی کی بانہوں میں تھی اور اس نے محسوس کیا کہ میری کے گالوں پر آنسو تھے۔ ''تم نے مجھے یہ بات کیوں نہ بتائی؟ میرے سوا ساری بلڈنگ کو اس کا پتا تھا! تم بڑی وہ ہو راز چھپانے میں! میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں... ہیر رچرڈ، میں فوراً آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'' زینے میں اندھیرا تھا۔

''اچھا، اور اب کیا؟''

''میں کتنی خوش ہوں۔''

اینا بھی خوش تھی۔ خوشی کی کیا ریل پیل ہے، اس نے سوچا۔ خوشی کی ریل پیل! اس احساس سے معمور وہ دروازے تک گئی، اسے کھولا اور لیمپ جلا دیا۔

وہ یہ کہہ سکتی تھی کہ کارل اس کا شوہر نہیں ہے، کہ وہ اس کا چاہنے والا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے راز کی طرح چھپایا جاتا۔ ان عورتوں کا جن کے شوہر میدان جنگ میں تھے، دوسرے مردوں سے کھلم کھلا تعلقات رکھنا بلڈنگ کے باسیوں کے نزدیک عام سی بات تھی۔

اور وہ، جھوٹی قرار دیے جانے کے خوف کے بغیر، کہہ سکتی تھی کہ کارل اس کا شوہر ہے کیوں کہ ان آٹھ دنوں میں — ان دونوں کے شہر میں وارد ہونے سے جنگ چھڑنے تک — رچرڈ نے کسی سے تعلقات پیدا نہ کیے تھے، بلکہ اپنے پڑوسیوں تک سے بات نہ کی تھی۔ اور اس بات کو چار سال ہو چکے تھے۔

لیکن ان تاملات کا، گو وہ خیال کی سی تیزی کے ساتھ اس کے ذہن میں کوند گئے، اینا کے فیصلے میں کوئی دخل نہ تھا جو اس کی اپنی خواہش اور اس بات کا نتیجہ تھا جس کا اسے ابھی ابھی کارل کی رفاقت میں تجربہ ہوا تھا۔

یہ سوال کہ آیا وہ رچرڈ تھا یا نہیں، اب کسی اہمیت کا حامل نہ رہا تھا۔ اینا جانتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں

بول رہا ہے اور خود اس کا جذبہ اور تجربہ جھوٹا نہ تھا۔ یہ تو خوشی تھی، حقیقی اور سچی۔ اگر کارل کا اور ان کی خوش بختی کا منشا یہی تھا تو ان سب کو یہ سمجھنے دو کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ اور وہ — کیا خود اس کی یہی خواہش نہ تھی؟

وہ وہاں کھڑا تھا۔ اور اس نے میری سے ہاتھ ملایا، بالکل پرسکون۔ وہ اپنے چمکیلے چہرے سمیت بالکل پرسکون وہاں کھڑا تھا۔

ارے، اس کی بھی تو یہی خواہش تھی! وہ یہی چاہتی تھی! وہ یہی چاہتی تھی... یہ خودسر شخص، جو اتنا ساکن رہ سکتا ہے جتنا کہ وہاں کھڑکی کی چوکھٹ پر دھرا جے رے نیئم کا پودا، محض اس لیے کہ وہ بھی خوش تھا اور اب تنہا نہ تھا... اب تنہا نہ تھا! یہ کتنا اچھا تھا، کتنا اچھا!... میری کا دمکتا چہرہ۔ وہ خوشی کے مارے بیچ بیچ بیک وقت ہنس اور رو رہی تھی۔ زندگی آخر کار حسین ہی تھی۔ بس وہ اتنے عرصے سے اینا کو نظر انداز کرتی رہی تھی۔

سہ پہر کو بیچ میل آوازوں میں جھگڑے فساد کی بجائے پُرامن خاموشی صحن سے بلند ہو کر ان تک پہنچی۔ عجیب سُر، باریک اور نازک، سنائی دینے لگے۔ بلڈنگ کے دو موسیقار اپنے خانہ ساز باجوں کے سُر ٹھیک کر رہے تھے: ایک پیانو — چیڑ کا بنا ہوا مکارونی کا ڈبا، ایک فٹ آٹھ انچ لمبا، جس پر کالے اور سفید رنگ کے پردے بنے ہوئے تھے — اور ایک چوتارا، جسے پرانے سگار کے ڈبے سے بنایا گیا تھا۔

ایک موسیقار نے چھوٹے سے نازک پیانو کو اٹھا کر چوکی پر رکھ دیا، جو وہ ساتھ لائے تھے، اور احتیاط سے اسے ٹھیک طرح جما دیا تاکہ وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے رکھا رہے اور ٹوٹ پھوٹ نہ سکے؛ دوسرے نے اپنے چوتارے کا دھیرے سے رخ پلٹا — چوتارے کی گردن چیلو سے مشابہ تھی — اور گردن کو احتیاط سے چوکی کے ساتھ ٹیک دیا۔ موسیقی بھی یکساں طور پر محتاط معلوم ہو رہی تھی۔

کاریگر کے بڑے بڑے ہاتھوں اور پیانو نواز کی موٹی موٹی انگلیوں کے لیے پردوں کے تختے پر مشکل سے جگہ موجود تھی۔ دونوں موسیقاروں کو اپنے فطری دم خم کو قابو میں رکھنا پڑا، مبادا گانے بجانے کے دوران میں ان کے چھوٹے چھوٹے بودے باجے ٹوٹ پھوٹ جائیں۔ چنانچہ وہ اچھی موسیقی سنانے پر مجبور ہو گئے۔ وہ دھنیں گاتے رہے۔ بلڈنگ میں رہنے والے سینکڑوں آدمی سنتے رہے۔ کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ شیر خوار بچے تک چپ ہو گئے تھے۔ اینا کے کمرے میں تینوں دوست بھی سنتے رہے۔ سُر دلکش تھے۔

جب وہ گا بجا چکے تو بھورے بالوں والے چار سالہ لڑکے نے گلا پھاڑ کر اپنا گیت گانا شروع کر دیا: ''میر تخمین کے بچہ ہوا جی بچہ ہوا۔'' وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ موسیقی اس کے سر پر سوار ہو گئی تھی۔ وہ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر منہ اٹھائے چیخ رہا تھا۔ اسے اور کچھ پتا نہ تھا۔ اس نے جوش میں آ کر اپنے بازو اور ٹانگیں نچائیں۔ ''ماں کو یہ پتا نہیں بچے کا باپ کون ہے۔''

۵

پڑوسیوں نے صورت حال کا تعین کرنے میں ہاتھ بٹایا۔ ان کے لیے کارل اینا کا شوہر تھا۔ بچے اسے ''ہیر رچرڈ'' کہہ کر سلام کرتے تھے۔ پنساری، نانبائی، قصائی نے اینا کو شوہر کے لوٹ آنے پر، جسے وہ سب متوفی سمجھے بیٹھے تھے، مبارک باد پیش کی۔ ساتھ والے کرائے دار، صبح شام، اسے ''ہیر رچرڈ'' کہہ کر سلام کرتے تھے۔ میری کو اس سے ''تھوڑی سی محبت'' ہوگئی تھی۔ ''بہت زیادہ نہیں۔'' اسے اجازت تھی کہ وہ اسے ''رچرڈ'' کہہ کر بلائے، سب لوگ اسے ہیر رچرڈ کہتے تھے۔ اینا خود اسے رچرڈ ہی کہتی تھی۔ اور وہ نہ صرف یہ نام لیتی رہی بلکہ یہ رفتہ رفتہ ایک معمول اور کارل کے لیے اینا کے احساس کا حصہ بن گیا۔

اب اسے فیکٹری میں کام کرنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس کے شوہر کو ملازمت مل گئی تھی۔ ہر سنیچر کو کارل ہفتے بھر کی تنخواہ آخری پفینگ تک اینا کے حوالے کر دیتا۔ پھر وہ ہمیشہ کی طرح پیٹی کو جھٹکا دے کر اوپر کھینچتا اور لڑکوں کی طرح ہاتھ پھیلا دیتا۔ اور اینا اس کا جیب خرچ اسے دے دیتی۔

اینا کا پلنگ دو کے لیے خاصا چوڑا تھا۔ کارل دیوار کی طرف سویا کرتا۔ وہ صبح کو چپکے سے اٹھ جاتی اور ناشتہ تیار کرتی، جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا۔

وہ اپنے ناگفتہ وعدے پر قائم رہی تھی: اسے حمل ٹھیرے تین ماہ ہو چکے تھے۔

کارل اسے بوجھ اٹھانے یا اٹھا کر لے جانے نہ دیتا۔ کام پر سے آنے کے بعد وہ دوڑ دوڑ کر سیڑھیاں اترتا چڑھتا، لکڑی اور کوئلہ اور آلو اٹھا کر لاتا، اور فرش کو رگڑ کر صاف کرتا۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اچھے بن جاتے ہیں، اور بنے رہتے ہیں، بشرطیکہ حالات ان کا ساتھ دیتے رہیں؛ اور عورتیں جو، جب وہ ہنسی خوشی محبت میں گرفتار ہوں، ناقابل توجیہہ طور پر خوبصورت ہوتی چلی جاتی ہیں، جو ہمیشہ اپنی آنکھوں اور چہروں میں ایک گہری اور درخشاں دمک لیے پھرتی ہیں، جسے کوئی شخص دیکھے اور محسوس کیے بغیر سڑک پر ان کے پاس سے گزر نہیں سکتا۔

دن میں سو مرتبہ اینا پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا — جب وہ اپنے آدمی کو دیکھتی، جب وہ اس کا خیال کرتی، جب اسے کوئی ایسی بات یاد آتی جو کارل نے اس سے کہی تھی، اور یہ کہ اس نے کس طرح اس کی طرف دیکھا تھا، اور یہ کہ وہ اس سے حاملہ ہو چکی تھی۔ اینا کی زندگی نغمہ سرا تھی۔

کارل کا جذبۂ وابستگی پُر جوش اور ساتھ ہی شفقت آمیز اور مائل بہ تحفظ تھا، جیسا کہ ماں کا پیار ہوتا ہے۔ گھر میں، سڑک پر، فیکٹری میں، کام پر جاتے اور گھر آتے ہوئے وہ صرف اینا کو دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔ اس کی زندگی اینا تھی۔ اس کے لہو نے اینا کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ ہر طرح سے مطمئن تھا: اینا اس سے محبت کرتی تھی۔

شام کو وہ ایک چھوٹی سی ایجاد کی تکمیل میں مصروف رہتا — ایک گھومنے والے خراد کے کام کو بہتر بنانے کا ایک طریقہ — جسے آزمایا جاچکا تھا اور جس سے کارل کو چند ایک سو مارک کی آمدنی ہوچکی تھی، اس بچے کی خاطر جس کی انھیں توقع تھی۔

ایک شام گھر لوٹتے ہوئے یہ خیال کہ وہ اینا کو گھر میں موجود پائے گا، کارل کے اندر ایک صاف نیلی جھیل کے مانند تھا۔ اس بات کی آگہی اس میں سماگئی اور جب اس نے اینا کو وہاں نہ پایا، جب وہ کمرے میں نظر نہ آئی، تو پھر بھی وہ وہاں موجود تھی — اس انداز میں جس انداز سے گیس کے چولھے کے پاس ایک گلاس رکھا تھا، جس انداز سے ایک کرچھا ٹنگا ہوا تھا، جس انداز سے اس کے سینے پرونے کی پٹاری کھڑکی کی چوکھٹ پر پڑی ہوئی تھی۔

جب وہ اندر آئی تو وہ، چپ چاپ بیٹھا، نگاہوں سے اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جب ہوا کے ایک جھونکے نے اینا کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو چھیڑا تو وہ خوش ہوا۔ اینا نے یہ سب محسوس کیا۔ کھانا تیار کرتے ہوئے جب وہ اس کے قریب سے گزری تو اس نے کارل کے سر اور کندھوں کو تھپکا۔

''تم کہاں گئی ہوئی تھیں، اینا؟''

جب اینا نے، اس آواز میں جو اس پر اس قدر پھبتی تھی، جواب دیا تو یوں لگا جیسے خود مسرت بول اٹھی ہو: ''میں موچی کے پاس گئی تھی۔ میرا خیال ہے وہ تمھارے بوٹوں کی معقول مرمت کردے گا، رچرڈ۔''

یہ بات کارل کو یوں سنائی دی جیسے اینا نے کہا ہو: ''تم مجھے اپنی جان سے بھی پیارے ہو۔''

اینا اسے اپنی جان سے ہزار گنا زیادہ پیاری تھی۔ واپس آنے سے پہلے اس کی زندگی تنہائی سے پیدا ہونے والی دل ماندگی اور دائمی بے قراری سے عبارت تھی۔

جس بات نے ان دونوں کو اپنے ساتھ والوں سے متمیز اور سر بلند کیا تھا وہ یہ تھی کہ انھیں اپنی خوشی کا شعور حاصل ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی لمحہ حال کی، گہرائی، وہ داخلی ملائمت بھی مسخر ہوگئی تھی جو کسی بھی لمحے خود کو بیک نظر افشا کرسکتی تھی۔

انھوں نے اپنے عشق کی باطنی روشنی سے متحد ہوکر بدن سے، رات کے بوس و کنار سے شناسائی پیدا کی۔ اور ان کے واسطے فراق کا کوئی موقع نہ آیا۔ اپنے اختلاط میں انھوں نے زندگی کی معراج اور معنی کو پالیا۔

جزئیات میں کل سمٹ آیا تھا۔ اینا کے سوتی لباس کی، جو اس کی کمر سے نیچے پھیل کر اس کے کولھوں کے خطوط کا تعین کررہا تھا، جہاں سے اس کا رنگ دھوپ سے قدرے اڑ گیا تھا، ایک تنگ سلوٹ اپنے اندر کارل کے لیے اس کی محبت کی لامحدودیت سمیٹے ہوئے تھی۔

وہ زیادہ باتیں نہ کرتے تھے۔ وہ روانی سے گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ ان کے پاس تو زندگی کی بھرپور، متین دھڑکن، جچا تلا قدم، چمکتا ہوا چہرہ تھا۔ وہ مالا مال تھے۔

اینا، سگھڑ اینا، اپنا سینے پرونے کا سامان کونے میں پھینک سکتی تھی، اور اینا کے ساتھ اسی وقت وہ بھی اٹھ کھڑا ہوتا۔ ''آہا، چلو باہر چلیں۔''

ان کے پاس شہر تھا اور شہر کے لوگ تھے، ارد گرد کے کھیت، کھلی ہوا، جنگل تھا کیوں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس تھے۔

ان کی ایک چہل قدمی کے بعد، جس کے دوران میں وہ ریل کی بڑی پٹری کے کنارے کنارے ٹہلتے رہے تھے — تار برقی کے خالی خالی کھمبے جو دور تک پھیلے چلے گئے تھے، انھیں خوبصورت معلوم ہوئے تھے — میری سسکیاں بھرتی ہوئی ان کے کمرے میں آئی۔

اس کا بہنوئی محاذِ جنگ سے چھٹی پر گھر آیا تھا، دیر تک موٹر مستری کے ننھے بیٹے کو گھورتا رہا تھا، بیوی کی بیان کی ہوئی وجوہات سنتا رہا تھا، اور جواب میں ایک لفظ کہے بغیر، گھر سے نکل، اگلی گاڑی سے محاذ جنگ کو لوٹ گیا تھا۔

وہ تینوں لیمپ کے نیچے میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میری رو رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا۔ اینا نے اپنا رومال اسے دے دیا۔

''ہمیں ہرگز خیال نہ تھا کہ وہ اس کا اتنا برا مانے گا۔''

اینا نے کارل اور پھر میری کی طرف دیکھا۔ ''اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟'' اینا کو محسوس ہوا کہ اس کا کلیجا منھ کو آ گیا ہے، اور وہ سمجھ نہ سکی کہ ایسا کیوں ہے۔ ''وہ اس کی بیوی تھی۔''

''جب فراؤ موسر کا میاں واپس آیا تو وہ آدمی — فرنز — چلتا بنا جس کے ساتھ وہ رہنے لگی تھی۔ یہی ٹھیک اور مناسب تھا۔ یا ہیر ہاؤسلر کو دیکھ لو۔ اسے لوٹے ہوئے تین ہفتے ہو گئے لیکن ڈاک خانے کا اسسٹنٹ اب بھی انھیں کے پاس ٹھیرا ہوا ہے، جب تک اسے کوئی اور کمرہ نہیں ملتا۔ وہ تینوں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں،'' میری نے، جو اَب بھی رو رہی تھی، کہا۔

''لیکن ہیر لینسیرٹ نے تو اپنی بیوی کو پیٹ پیٹ کر تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔ اور اب وہ علیحدہ ہو گئے ہیں۔ تم اس بات کو معمولی سمجھ رہی ہو، میری، بہت معمولی۔''

''یہ کچھ تو ہمارے رہن سہن کا طریقہ ہے، جس طریقے سے ہم رہتے سہتے ہیں کچھ تو اس کا قصور ہے... لیکن وہ لوٹ آئے گا۔ بے شک وہ لوٹ آئے گا اور میں اس کے گلے لگ جاؤں گی، اینا، میں گلے لگ جاؤں گی۔''

"تینوں ایک ساتھ رہتے ہیں، تم کہہ رہی ہو، تینوں ایک کمرے میں؟" اینا نے کارل کی طرف دیکھا۔ اس نے ابھی تک ایک لفظ نہ بولا تھا۔ اس کی آنکھیں کمرے میں نہ تھیں، اینا کو پتا نہ تھا کہ اس کا دل تیزی سے کیوں دھڑک رہا ہے۔

"میں اس کے گلے لگ جاؤں گی۔ اور پھر وہ دوبارہ مہربان ہوجائے گا۔" میری کے دلکش چہرے پر ابھی سے مسکراہٹ آگئی تھی۔ گالوں کے گڑھے پھر سے نمودار ہوگئے۔ "رچرڈ، میں کچھ کافی بنانے لگی ہوں۔ بنالوں، اینا؟"

ایسا اکثر ہوتا کہ دوسرے ابھی افسردہ خاطر ہوتے تو میری ہنسنا شروع کردیتی یا دوسرے ابھی مذاق کرنے میں مشغول ہوتے تو میری آنسو بہانے لگتی۔ واقعات اسے بہت سرعت اور شدت سے متاثر کرتے تھے، اور اتنی ہی تیزی سے وہ پھر چونچال ہوجاتی تھی، جیسے کوئی کاگ جو ہر لہر کے ساتھ ڈبکی کھاتا ہے، لیکن ڈوبتا کبھی نہیں، چاہے تند سے تند طوفان آجائے۔

کارل کی آنکھیں ابھی تک اسی لق و دق میدان میں تھیں جو یورپ اور ایشیا کے درمیان واقع ہے۔ اینا نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھ لیا، جہاں اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

ایک چھوٹا سا شکنجہ پیچوں کے ذریعے کھڑکی کی چوکھٹ پر کسا ہوا تھا۔ اوپری کام، جس کے لیے اسے خراد کی ضرورت پڑتی تھی، وہ فیکٹری میں مشین پر کرتا تھا، لیکن ریتی پھیرنے اور پرزے جوڑنے کا کام شام کو گھر پر انجام دیتا تھا۔ وہ پورے سائز کا آخری نمونہ تیار کررہا تھا۔ نمونہ لڑکے کی مٹھی سے بھی چھوٹا تھا۔

جس انداز سے وہ آخر اپنی جگہ سے اٹھا، چوکھٹ پر اپنے نمونے کے کل پرزے جمائے، ریتیاں چنیں، اور کام شروع کیا، اس سے اینا نے محسوس کیا کہ وہ موت کے سوا کسی سے ہار نہ مانے گا۔

دونوں کپکپا اٹھے جب انھوں نے محسوس کیا کہ تقدیر کے پر وبال کے سرے انھیں چھوتے ہوئے گزر گئے ہیں اور یوں اس رات وہ بستر پر لیٹے، اس فضل ایزدی کے ہاتھوں دل سے دل جوڑے جو انھیں زندگی دے سکتا تھا، موت دے سکتا تھا، لیکن جدا نہ کرسکتا تھا۔ جرم کا کوئی خیال ان کے دل میں نہ تھا۔

آٹھ دن بعد میری کی بہن کو فوجی حکام کی طرف سے یہ خبر ملی کہ اس کا شوہر چھ روز قبل ہلاک ہوچکا ہے۔

بلڈنگ کے بہت سے ساکن، جنھوں نے پہلے کبھی کوئی نامساعد رائے ظاہر نہ کی تھی، اب میری کی بہن کو قصوروار ٹھیرانے لگے۔ اسے بے نقط سنائی جانے لگیں۔ اس نے اپنے میاں کو کھدیڑ کھدیڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اسے گالیوں سے بھرے خط موصول ہوئے۔ موٹر مستری، اپنے قصور سے واقف، صبح شام صحن پار کرتے ہوئے، سر اکڑائے، ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہتا۔ خود اپنے کمرے میں بھی وہ صرف اسی

وقت بات کرتے جب ضرورت پڑتی۔ عورت اپنا کام کاج کرتی رہتی۔ ایسے اندوہ ناک واقعے کے بعد جب چند ہفتے گزر جاتے ہیں تب کہیں زندگی کی مقررہ عادتیں دوبارہ سر اٹھا سکتی ہیں۔

پڑوسی اور موٹر مستری جلد ہی سیڑھیاں اترتے چڑھتے سر کے اشارے سے ایک دوسرے کو سلام کرنے لگے اور میری کی بہن کو صرف خاص خاص موقعوں پر یہ سننا پڑتا کہ وہ کس قماش کی عورت ہے؛ مثال کے طور پر جب وہ دھوبی خانے میں اپنی کپڑے دھونے کی باری کا پُرزور دعویٰ کرتی، جس کا استعمال ہمیشہ سے مختلف ٹولیوں کے درمیان فساد کی جڑ ثابت ہوتا تھا۔

دونوں لڑکوں اور باقی ماندہ بچوں کی فوج کے درمیان لڑائیاں دیر تک جاری رہیں۔ دن میں کئی مرتبہ، اس طعنے کی وجہ سے کہ ''تمھاری ماں چھنال ہے!'' جو ہر دروازے اور کونے سے پکار پکار کر دیا جاتا، انھیں اپنی ماں کی عزت کی خاطر جھگڑوں میں الجھنا پڑتا۔

اینا کھلی ہوئی دراز کے پاس کھڑی تھی۔ وہ صوفے پر لیٹی لیٹی یکا یک اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور دراز کے پاس آگئی تھی اور اب وہاں کھڑی دراز میں جھانک رہی تھی اور اسے پتا نہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔

لیکن جب اس نے وہ رنگ اڑا پوسٹ کارڈ ہاتھ میں لیا جس کے ذریعے، چار سال پہلے، فوجی حکام نے اسے مطلع کیا تھا کہ رچرڈ مارا گیا ہے، تو ایک گرم چھیدتی ہوئی چوٹ اسے لگی اور جسم کے آرپار ہو گئی۔ وہ مشینی انداز میں پڑھنے لگی۔

لیکن اب وہ بس آیا ہی چاہتا ہے، اس نے سوچا، اور کسی ٹھنڈک پہنچانے والی بوچھار کی طرح امن نے نزول کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمھیں پتا ہے کہ میں شادی سے پہلے لڑکپن میں یا بالکل بچپن میں کیا کرتی رہی ہوں۔''

بے شک، اسے معلوم تھا جب اس نے یہ بات کہی تھی کہ ہاں، اسے (کارل کو) ہر بات پتا تھی۔ دنیا کے ہر آدمی سے زیادہ۔ خود وہ اپنے بارے میں جتنا جانتی تھی اس سے بھی زیادہ۔ اور یہ سب اس لیے کہ وہ اس سے اتنا پیار کرتا تھا۔ اینا صرف اسی کو چاہتی تھی؛ زندگی بھر صرف اسے۔ باقی ہر بات ناممکن تھی، بلکہ خیال میں بھی نہ لائی جا سکتی تھی۔

بہت سال پہلے، ماضی بعید میں، کوئی بات ہوئی تھی۔ ''۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کو لڑتے ہوئے مارا گیا۔'' اور اس بات کی بس یہی نشانی رہ گئی تھی — یہ پوسٹ کارڈ۔ کیا یہ سچ تھا؟ لیکن وہ تو کہتا تھا کہ فوجی حکام سے غلطی ہوگئی تھی... انھیں کس چیز کے بارے میں غلط فہمی ہوئی تھی؟ کس چیز کے بارے میں؟ یہ کہ وہ اس کا شوہر تھا؟ یا کیا؟

اسے یکا یک اپنے سر اور اعضا میں اتنی تھکن محسوس ہوئی کہ صوفے تک پہنچنے کے لیے فرنیچر کے کناروں کا سہارا لینا پڑا۔ وہ صوفے پر گر گئی اور اسے فوراً نیند آ گئی۔

چھ اور پھر سات بج گئے۔ وہ گہری، خوابوں سے خالی، نیند سو رہی تھی، اس کے عضلات اور اعضا ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ڈاکیے نے پیتل کے کھٹکھٹے کو آہستہ سے چھیڑا اور درز میں سے ایک خط اندر سرکا دیا۔

ثانیے کے اس دسویں حصے میں خواب، خاموشی میں بجلی کی پہلی کڑک کی طرح اس کے آرام میں خلل ڈال کر، شروع ہوا۔ وہ، خوف زدہ ہو کر، اچھل پڑی، اور دروازے تک گئی۔ فرش پر رچرڈ کا خط پڑا تھا۔ وہ اسے اٹھا نہ سکی کیوں کہ وہ تار کے چار نگندوں سے جڑا ہوا تھا۔

اب تو شاید ممکن نہیں کہ میں اسے پڑھ سکوں۔ یہ اچھی بات ہے۔ میں اسے نہیں پڑھ سکتی۔ اسے کیل بٹن خود نکالنے پڑیں گے۔ وہ اب آتا ہی ہوگا۔ لیکن اگر اس نے یہ خط پڑھ لیا تو ہر چیز تباہ ہو جائے گی۔ کتنا ہولناک! سب کچھ تباہ — ہر چیز!

وہ موچنا اٹھا لائی، گھٹنوں کے بل جھک گئی، تین کیل بٹن کھینچ لیے، پھر تین اور لمبے بٹن کھینچے۔ لیکن پھر بھی خط میں چار کیل بٹن باقی رہ گئے۔ یہ اچھی بات ہے! اس خط کو کوئی نہیں کھول سکتا۔ مطمئن ہو کر وہ لیٹ گئی تاکہ سونا جاری رکھے، اور جاگ اٹھی۔

ہاں، وہ تو صرف خواب تھا کہ خط کیل بٹنوں سے جڑا ہوا تھا۔ خط تو وہاں فرش پر پڑا ہے۔ میں تو صرف خواب دیکھ رہی تھی۔ صرف کمرے کے پار جانے کی ضرورت ہے اور میں اسے اٹھا لوں گی۔ وہ دروازے تک گئی، نیچے خط پر نظر ڈالی، اور اسی لمحے اس نے رچرڈ کو، اچانک نور کی ایک فلک بوس، غیر مرئی دیوار کے آگے کھڑے دیکھا۔ ''یہ تو کسی چیز کی دیوار نہیں،'' وہ بولی۔

رچرڈ کا کوئی سر نہ تھا، وہ اسے جن آنکھوں سے دیکھ رہا تھا وہ وہاں موجود نہ تھیں اور وہ ایک غیر مرئی منھ سے بولا: ''مجھے وہ کانٹا دو۔''

اینا نے اسے وہ کانٹا پکڑا دیا جس کی ایک شاخ باقی دو شاخوں سے چھوٹی تھی۔ رچرڈ، سر کے بغیر، میز پر بیٹھ گیا، اور اپنی ڈبل روٹی کو لمبے لمبے ٹکڑوں میں کاٹنے لگا۔

یہ پھر محض ایک خواب ہے۔ میں اس کی تاب نہیں لا سکتی۔ مجھے ضرور اٹھ جانا چاہیے۔ جاگ اٹھوں! ضرور جاگنا چاہیے! مفلوج زور لگا کر اس نے تڑپ تڑپ کر خود کو ربڑ کی موٹی، لجلجی بندشوں سے چھڑایا، دو ڈگ بھر کر خط کی طرف لپکی، لفافہ پھاڑ کر کھولا، اور دل کے اضطراب اور کرب کے مارے پڑھ نہ سکی۔

وہ ابھی تک، ٹھوڑی کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے، صوفے پر لیٹی ہوئی گہری نیند سو رہی تھی۔ رچرڈ، سر کے بغیر، میز پر بیٹھا تھا۔ وہ منھ چلاتا رہا۔ پیار بھرے انداز میں مسکرایا، اور اینا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:

''کوئی مضائقہ نہیں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ بات اسی طرح پیش آنی تھی۔ تھوڑی دیر اور سولو۔''

حیرت انگیز امن اس پر طاری ہوگیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ دوبارہ سو چلی ہے اور سوتے سوتے ہی نیند سے حاصل ہونے والی گہری تسکین کو محسوس کیا۔

جونہی خط فرش پر گرا اینا کا خواب ختم ہوگیا۔ وہ شروع تو اس وقت ہوا تھا جب ڈاکیے نے ثانیے کے دسویں حصے پہلے پیتل کے کھٹکھٹے کو چھیڑا تھا، مگر اینا کے خوابیدہ شعور میں وہ کئی گھنٹے جاری رہا تھا۔

آہٹ ہوتے ہی، وہ سونے اور خواب دیکھنے سے جاگ اٹھی۔ اسے لکڑی کی سیڑھیوں پر ڈاکیے کے میخ دار جوتوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی جو نیچے جا رہا تھا، اور فی الفور یاد آگیا کہ اس نے خواب دیکھا ہے کہ اس کے پاس رچرڈ کا خط آیا ہے۔

اس کے دل نے زور زور سے دھڑکنا بند کردیا۔ اس نے سوچا کہ وہ ابھی خواب ہی دیکھ رہی ہے، اور گہری تشویش کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھا کر گلے پر رکھ لیے۔ فرش پر ایک خط پڑا ہوا تھا۔

سرخ پنسل کے نشانات اور متعدد سنسروں کی ربڑ کی مہروں سے لفافے کا، جس پر ولندیزی ٹکٹ لگے ہوئے تھے، حلیہ بگڑ چکا تھا اور اس سے کاربولک کی تیز بو آرہی تھی۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ شادی سے پہلے اینا نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے پاس ماں کا خط آیا ہے، جو ایک محتاج خانے میں رہتی تھی اور جس نے برسوں سے خط نہ بھیجا تھا، اور جب وہ جاگی تھی تو ڈاک کے بکسے میں خط موجود تھا۔

اس کے اولیں اضطرار نے اسے اکسایا کہ وہ خط کو پڑھے بغیر جلا دے۔ خوف سے سن، وہ گیس کے چولھے پاس پہنچی۔

> ''پیاری اینا! ابھی مجھے پتا نہیں کہ آیا میں انگریزوں کی قید میں ہوں یا جاپانیوں کی۔ میں ایک جہاز پر ہوں۔ یہ لوگ ہمیں کوئلے کے پیپوں میں ٹھونس دیتے ہیں اور ہم پسینے میں نہاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ والا جہاز کل ایک بارودی سرنگ سے ٹکرا گیا۔ بس دو دھماکے ہوئے اور پورا جہاز ڈوب گیا، نشان بھی باقی نہ رہا۔ لیکن گھنٹوں بدبو پھیلی رہی۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکتے۔ آج ہم پھر سفر کر رہے ہیں۔ ہمیشہ بارودی سرنگ زاروں میں سے ہوکر۔ ہم میں سے کسی کو خبر نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں یہ خط ایک ولندیزی کو دے دوں گا، کیوں کہ وہ اسے گھر جانے کی اجازت دینے والے ہیں۔ اگر یہ خط کبھی تم تک پہنچ جائے، پیاری اچھی اینا، تو یاد رکھنا کہ میں تم سے اب بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کہ تمھیں پتا ہے میں کرتا ہوں۔ میں پسند کروں گا کہ بالآخر

ہمارے چھوٹے سے کمرے میں تمھارے پاس پہنچ جاؤں، لیکن کھانا اچھا ملتا ہے
اور کافی ہوتا ہے۔"

خط تین مہینے پہلے لکھا گیا تھا۔ اینا برف کی طرح پرسکون ہوتی گئی، جیسے کوئی آدمی، جب بجلی کا کوندا اس کی آنکھوں کے سامنے سے لپک گیا ہو، صدمے کے بیچ میں یکا یک پرسکون ہو جاتا ہے۔

خط سے بڑی تیز بو آرہی تھی، لفافے کی بو سے بھی تیز، اور اینا کا جی متلانے لگا جیسے اس کا معدہ باسی پانی سے بھرا ہوا ہو۔ اس نے خط کو تختے پر، پھلوں کی اچاریوں کے قریب، رکھ دیا۔ وہ تختے کے کنارے سے ذرا باہر نکلا رہا۔ اینا نے اسے انگشت شہادت سے احتیاط سے پیچھے کھسکایا یہاں تک کہ دونوں کنارے برابر ہو گئے۔

بچے نے اس کے رحم میں حرکت کی۔ اسے جلدی سے بھاگ کر نیچے دکانوں تک جانا پڑا۔ رچرڈ گھر آنے ہی والا ہوگا۔ کیا دکانیں ابھی کھلی ہوں گی؟ رچرڈ آتا ہے تو ہمیشہ اتنا بھوکا ہوتا ہے۔ لیکن وہ خط جو آ گیا تھا— رچرڈ کا خط۔ شاید وہ اب بھی چند ایک انڈے خرید سکے... ہاں، اگر وہ اتفاق سے دوسرے جہاز پر ہوتا تو ہم ایک دوسرے کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاتے... دودھ مکھن کی دکان ہمیشہ ذرا دیر تک کھلی رہتی ہے۔

پہلی منزل پر پہنچ جانے کے بعد اس نے واپسی کا قصد کیا، دوبارہ معمول سے زیادہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھیں، جلدی جلدی دروازے کا تالا کھولا، اور خط دوبارہ پڑھا۔ یہ سب ضرور غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ تو محض کاغذ کا ٹکڑا ہے، الفاظ، پنسل سے لکھے ہوئے الفاظ ہیں۔ یہ ایک گزشتہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ فوجی حکام کے بھیجے ہوئے پوسٹ کارڈ کی طرح۔ بہت، بہت سال پہلے۔ یہ الفاظ اس کی زندگی کو کس طرح تہہ و بالا کر سکتے ہیں جب وہ ہر روز اتنی فطری، اتنی بھرپور اور خوبصورت اور شادکام ہے؟"... میں تم سے اب بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کہ تمھیں پتا ہے میں کرتا ہوں، اور میں پسند کروں گا کہ بالآخر ہمارے چھوٹے سے کمرے میں تمھارے پاس واپس پہنچ جاؤں۔ لیکن کھانا اچھا ملتا ہے اور کافی ہوتا ہے۔"

وہ یہاں کیسے آ گئی؟ کیا وہ سیڑھیاں اتر کر، سڑک پر چل کر، دکان میں آئی ہے؟ یہ کیسے ہو گیا؟ ذہن میں وہ ابھی اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی خط پڑھ رہی تھی۔ اس نے گڑبڑا کر سر اٹھایا۔

"آج تم پیلی نظر آرہی ہو، فراؤ اینا،" ڈیری کی مالکہ نے کہا۔ "لیکن تم جس حالت میں ہو اس میں عورت کو الٹ پھیر سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ ایک منٹ پہلے تمھارے میاں یہاں تھے۔ مجھے پتا ہے تمھیں کیا محسوس ہو رہا ہے؛ میں یہ جھیل چکی ہوں۔ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم چنگی بھلی، صحت مند عورت ہو۔"

کارل نے دروازے کا دستہ گھمایا۔ "گھر پر نہیں۔" اس نے دروازے کا تالا کھولا۔ کمرے میں

داخل ہوکر تفتیش کے انداز میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ وہ خط کو سونگھ سکتا تھا۔ ''کار بولک،'' اس نے کہا، اور خوفزدہ ہوگیا۔ ''کوئی بات ہوگئی ہے کیا؟''

''تو میرا میاں چاہتا کیا تھا؟''

''اوہ، وہ تمھارے لیے دودھ کے سلسلے میں مجھے پھر دق کر رہا تھا۔ لیکن جو بھی سہی، میں جتنا دے سکتی ہوں تمھیں دے رہی ہوں۔''

اس خبر سے کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو وہ وہاں موجود ہوگا، سڑک پر چلنے، سیڑھیاں چڑھنے سے اینا کو وہ سکون اور استقلال میسر آگیا جو اس واقعے کا سامنا کرنے کے لیے لازمی تھا، جس نے اس کے ذہن میں اچانک اپنی اصلی اور ڈراؤنی سنگینی کا روپ دھار لیا تھا۔

وہ ابھی تک دروازے کے پاس کھڑا تھا، اور یہ خوف اس پر بری طرح سوار تھا کہ اینا شاید کسی حادثے سے دوچار ہوگئی ہو، کہ شاید وہ قبل از وقت وضع حمل کے دوران میں مرگئی ہو، یکایک اس نے خود کو ریل کی پٹری پر لائنوں کے بیچ میں، سینہ اور بازو سختی سے تان کر کھڑے دیکھا تاکہ وہ اس ریل گاڑی سے ٹکر لے سکے جو اس کی طرف جھپٹتی ہوئی آرہی تھی — تقدیر، جسے ہر قیمت پر روکے رکھنا تھا۔

پھر اس نے ایک چاپ سنی۔ فوراً پہچان لیا کہ وہ اینا کی تھی، سنتا رہا۔ دنیا بھر میں کوئی اینا کی طرح سیڑھیاں نہ چڑھتا تھا۔ وہ، بے خود ہوکر، تیزی سے پلٹا۔ ''تم آگئیں! کیا بات ہوگئی؟''

وہ دروازے میں، روبرو، کھڑے تھے۔

''میرے... میرے پاس میرے میاں کا خط آیا ہے۔''

فرض کرو کہ جتنے عرصے تم اس سے جدا رہے ہو اس نے بے وفائی کا ثبوت دیا ہو اور کسی اور کو اپنا بنالیا ہو؟ لق ودق میدان کی گھاس پر لیٹے لیٹے اس نے رچرڈ کا جواب سنا: ''تمھیں اس سے کیا سروکار؟ تم زبان درازی سے تو باز رہ سکتے ہو، کم از کم۔ اور جہاں تک اینا کا تعلق ہے، میں —'' اور اس نے دیکھا کہ رچرڈ نے کس طرح کدال کو سر سے بلند کیا اور زن سے اینا کے سر پر دے مارا۔

لیکن اینا نے اسے قطعاً دھوکا نہ دیا تھا، کارل نے سوچا؛ یہ معاملہ تو بالکل مختلف ہے۔ اس نے اینا کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اینا نے کاغذ کا تھیلا نیچے رکھ دیا اور، بیٹھتے بیٹھتے، کارل کی طرف دیکھا۔ ''اب مجھے سب کچھ بتادو!'' سچائی اور قسمت کے آگے سر جھکاتے ہوئے، اس درجہ متحمل اور تیار جیسے اس نے یہ کہا ہو: جو بھی ہو، میں کچھ اور نہیں کرسکتی۔ واپس آکر اگر وہ مجھے مار بھی ڈالے گا تو بھی میں اپنے فرض سے پہلوتہی نہ کروں گی۔

کارل بھی اپنے فرض سے پہلوتہی کرنے والوں میں نہ تھا۔ لیکن وہ مرد تھا، اور اپنی قسمت کے آگے

اسی وقت سر جھکا سکتا تھا جب وہ آخر تک، ذہن اور قوتِ ارادی سے، چاقو اور دانتوں سے، لڑ چکا ہوتا۔ موت، ہاں! لیکن دست برداری، نہیں! اس نے سوچا، اور اینا کو سب کچھ بتا دیا۔

وہ بیٹھے رہے یہاں تک کہ اندھیرا چھا گیا۔ لق و دق میدان میں گزاری ہوئی چار گرمیاں، جہاں ہر دن اپنی مکمل ویرانی میں آنے والے دن سے مشابہ ہوتا ہے، اور قیدیوں کے کیمپ کی بڑی بڑی بارکوں میں جاڑوں کے مہینے، سب اینا کی آنکھوں کے آگے پھر گئے۔ کارل نے کوئی بات پوشیدہ نہ رکھی۔ اینا کے روبرو روحانی طور پر برہنہ ہو جانے اور اسے یہ جتانے میں کارل کو لطف آیا کہ اس کا جذبہ کس طرح امڈا تھا اور کس طرح تمام حدود سے تجاوز کر گیا تھا۔

اینا نے سوالوں سے اس کی کہانی کے تسلسل میں اکثر خلل ڈالا، جن کا جواب کارل نے اس طرح دیا جیسے وہ خود اپنے آپ کو دیتا۔

''ایک مرتبہ رچرڈ نے مجھ سے کہا: میں اینا کا گرویدہ ہوں، جیسے مرد اپنی بیوی کا گرویدہ ہوتا ہے۔ اور اینا کا قصہ بھی بس یہی ہے، کیوں کہ میں اس کا شوہر ہوں۔ وہ سمجھ دار عورت ہے۔ اور پھر میں نے اچانک ایک دورویہ درختوں سے گھری سڑک پر، اس سڑک پر جو یہاں ہے، اینا، تمھیں دیکھا۔ تم وہاں انتظار کر رہی تھیں۔ شام ہو چکی تھی۔ اور کوئی نہ تھا — بس تم۔ اس بات نے مجھ پر اتنا اثر کیا۔ تم انتظار کر رہی تھیں۔ اس کیفیت کے لیے میں صرف یہی لفظ استعمال کر سکتا ہوں۔ ایسا لگتا تھا جیسے تم اس دھرتی پر نہیں ہو۔ اور پھر تم میرے پاس تھیں؛ میں دن رات تمھیں دیکھا کرتا۔ اس وقت سے میں تمھارے متعلق سب کچھ جان گیا۔''

اینا نے آنکھیں موند لیں؛ وہ اس کی جانب جھک گئی، اور وہ رخسار سے رخسار ملائے بیٹھے رہے۔ زندگی اور زمانہ اس عمیق ترین مسرت کے وصال کے دوران میں ختم ہو گیا جو انسانیت کے حصے میں نہیں آیا کرتی، کیوں کہ بالکل پاس ہی زندگی کا دکھ موجود ہوتا ہے، اور اس سے پہلے کہ دس دفعہ سانس لی جا سکے، دوبارہ اپنی بھاری اندھی پیش قدمی شروع کر دیتا ہے۔

''اگر اس نے مجھے جانے نہ دیا تو ہم دونوں زندہ نہ رہ سکیں گے۔''

''اگر صرف یہی ایک صورت ہے،'' کارل نے ایک بجھی بجھی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اور ایک دفعہ اور، موت کا دکھ جھیلنے کی آمادگی ظاہر کر کے، انھوں نے زندگی سے اجلے لمحے جیت لیے۔

جب وہ شام کا کھانا پکانے لگی اور وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا تو انھوں نے محسوس کیا کہ کھانا پکانا، روٹی کھانا، کام کاج، روزمرہ کا معمول اپنے خیالات و احساسات سمیت، تمام وزن، تمام موجود معنی اور قدر و قیمت کھو چکا ہے۔ اس وقت سے ان کی زندگی کا تمام پھیلاؤ انتظار کی نذر ہوگا۔ ان کی زندگی انتظار

کے سوا کچھ نہ تھی، جو زندگی کو ہڑپ کر لیتا ہے۔

کارل نے اپنا شغل چھوڑا، میز پر بیٹھ گیا اور سر کو دونوں مٹھیوں میں ٹیک کر، جیسے مشکل کام میں مصروف ہو، رچرڈ کا خط ایک دفعہ پھر پڑھا۔ ''... آج ہم پھر سفر کر رہے ہیں۔ ہمیشہ بارودی سرنگ زاروں میں سے ہو کر—'' اس نے زور سے پڑھا۔ اور ایک خواہش، خیال، اس کے خون سے پھڑ پھڑا کر دماغ میں پہنچا؛ اس نے کہا: ''شاید...'' اور اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

جو بات کارل نے کہی نہ تھی اینا نے فوراً محسوس کی اور سمجھ لی، اور اسے اپنی نظریں جھکانی پڑیں۔ انھوں نے وجود کو ایسی جگہ پر چھوا تھا جہاں سے احساسِ جرم، تاریک فوارے کی طرح، پھوٹتا ہے۔ لیکن جب انھوں نے نگاہیں اٹھائیں اور پیچھے ٹیک لگا لی اور آنکھوں آنکھوں میں، اپنی محبت کے اتھاہ اسرار کو محسوس کیا، جو رچرڈ کے حق کی مخالفت پر تلی ہوئی تھی، تو وہ دوبارہ اپنے آپے میں آکر، رچرڈ کی موت کی خواہش سے آزاد اور، اگر قیمت دینی ضروری تھی تو ادائیگی کے لیے آمادہ ہو گئے۔

دو افراد کا یہ فیصلہ کن اتصال، جس کے نیچے ساری زندگی کے مدفون معنی دہکتے نظر آتے ہیں، بہت سے ایسے خطرات پر قابو پانے کی قوت عطا کرتا ہے جو دوسروں کو تباہی، متعدد رکاوٹوں، بیماری اور موت تک کی طرف لے جائیں گے۔

نومبر آیا۔ منجمد خون اور کروڑوں قسمتوں کی وہ دبیز سرخ برفانی پپڑی جو یورپ پر جمی ہوئی تھی، پارہ پارہ ہو گئی۔ موروثی بادشاہتیں مٹ گئیں۔ تھکے ہارے شہر سپاہیوں سے بھر گئے۔

قیدیوں کا تبادلہ شروع ہو چکا تھا۔ چند آدمی، جو دشمن کی قید میں تھے، بلڈنگ میں واپس آگئے۔ کارل اور اینا منتظر رہے۔ ممکن ہے رچرڈ کسی لمحے دروازہ کھول کر اندر آجائے، یا شاید ایک مہینے یا ایک سال میں، یا کبھی نہ واپس آئے۔

کارل کی قوتِ ارادی اور جذبات پر بے حسی کا عالم طاری تھا۔ جدائی اس کی زندگی کو شیشے کی طرح چور کر دیتی۔ اینا اکثر آرزو کرتی کہ بحران آجائے، آفت ٹوٹ پڑے، کیوں کہ وہ اسے اس کی موجودہ حالت، یعنی امید اور مرنے کی مایوسانہ تیاری کے درمیان ڈھلملانے سے چھٹکارا دلا دے گی۔

پڑوسنیں اسے ان خانگی جھگڑوں کا قصہ سناتیں جو مردوں کی واپسی سے کھڑے ہوئے تھے، اور ایک معاملے کا تو خاص طور پر ذکر کرتیں جسے غالباً تباہی پر ختم ہونا تھا۔ مرد نے، جو گولیاں چلنے چلانے کا عادی ہو چکا تھا، بدترین بات سے آگاہ ہونے سے پہلے ہی عورت کو اپنے فوجی پستول سے دھمکا دیا تھا۔

کارل کو خطرہ تھا کہ کہیں اس کی نوکری نہ جاتی رہے، کیوں کہ اس نے ایک دوسرے شہر میں واقع کسی مل میں کچھ نئی مشینری نصب کرنے کا کام اپنے ذمے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ہر روز بلڈنگ سے نکلنے

اور ٹرام پر سوار ہونے کے ایک منٹ بعد، یہ بے چینی اور تشویش اس پر غالب آجاتی کہ مبادا اس اثنا میں رچرڈ واپس آگیا ہو اور یہ خدشات تمام دن اسے کارخانے میں ستاتے رہتے اور اس وقت تک چین کی سانس نہ لینے دیتے جب تک وہ دوبارہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں پہنچ نہ جاتا۔

ایک صبح — جب وہ کچھ فاصلہ طے بھی کر چکا تھا — وہ ٹرام سے کود گیا کیوں کہ اسے یقین آگیا تھا کہ ایک اور ٹرام میں جو اسی وقت پاس سے گزری تھی اس نے رچرڈ کو دیکھا تھا۔ وہ واپس بھاگا، اور اس نے دور سے ایک لمبے کوٹ والے فوجی کو بلڈنگ میں داخل ہوتے دیکھا۔ جب وہ سڑک پر کھلنے والے دروازے پر پہنچا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سینے پر ایک بھاری، ہوش مختل کرنے والا گھونسا لگا ہے۔ اب وہ درپیش تھا، وہ ہولناک واقعہ۔ وہ بالکل آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھا۔ دروازے پر، دوران سر کی کیفیت اس پر حملہ آور ہوئی۔ اسے پتا نہ چلا کہ اس نے دروازہ کیسے کھولا۔

فوجی کا نام و نشان نہیں۔ اینا کھڑکی کے پاس، بیکار، بے حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے، اور اس کے ادھ موئے چہرے کو دیکھ کر ذرا بھی متعجب نہ ہوئی۔

وہ بغیر کچھ کہے اینا کے پاس پہنچا، اس کا سر اپنے سینے سے لگایا، اور چپ چاپ دوبارہ باہر چلا گیا۔

۶

ایک ریل گاڑی، اتنی لمبی کہ جب اس کا آخری ڈبا ابھی اس گاؤں کے اسٹیشن سے نظر آسکتا تھا تو اس کا انجن اگلے گاؤں میں داخل ہو رہا تھا، شہر میں چلنے والی بس کی سی سست رفتاری سے برف کے ڈھیروں میں گھسٹ گھسٹ کر چل رہی تھی۔

ڈبوں کے سرے پر بنے ہوئے کھلے چبوتروں تک پر سپاہی بیٹھے اور کھڑے ہوئے تھے — چھوٹے ہوئے قیدی، ہر قماش کے گھر لوٹنے والے، اپنے بکس، بورے اور گٹھر اٹھائے۔ ہر کھڑکی سے گٹھر، سر اور پیٹھیں باہر نکلی ہوئی تھیں، مویشیوں تک کے ڈبے میں، ''آٹھ گھوڑوں کے لیے،'' جس کا چوڑا پھسلواں دروازہ غائب ہو چکا تھا، انسانوں کا بھورا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جس گاڑی میں تین ہزار مسافروں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اس میں دس ہزار ٹھونس دیے گئے تھے — ایک بدبختی ماری ریل گاڑی جو ایک بدبخت ملک میں رینگ رہی تھی۔

گاڑی اپنی عام رفتار سے دس گنی آہستہ چل رہی تھی۔ اوقات کا نظام ختم ہو چکا تھا۔ ڈرائیور کو اکثر پٹری ہی پر گاڑی روکنی پڑتی اور جب تک وہ بائلر کو دوبارہ گرم کرنے میں کامیاب نہ ہو جاتا، گاڑی کھڑی رہتی۔ انجن گھسا ہوا تھا۔ آدھا ایندھن ریت اور پتھر تھا۔

ایک سائیکل سوار دیہاتی سڑک پر پڑی ہوئی برف میں، بغیر زور لگائے، ریل گاڑی کے ساتھ ساتھ سائیکل چلاتا رہا، اور کھڑکی کے پاس بیٹھے ایک سپاہی سے آرام سے باتیں بھی کرتا گیا۔ ''ہاں، ہاں، انقلاب! اب حالت بدل جائے گی۔ بالکل مختلف ہوجائے گی۔'' اور جب گاڑی دوبارہ رکی، وہ اس پر سوار ہوگیا۔ نہ کوئی ٹکٹ تھا نہ کوئی اور چیز باقی رہ گئی تھی۔

ایک ڈبے میں، جو کسی زمین دوز حجرے کی طرح اندھیرا اور ملگجا تھا، جس سے دھویں، باسی سیلن اور کھٹے پسینے کی بو آرہی تھی، ایک فوجی نے، جو ایسے ملک سے آیا تھا جہاں اب بھی چاکلیٹ مل جاتے تھے، اپنے کوٹ کی جیب سے اس نعمت کی، روپہلی پنّی میں لپٹی ہوئی، ایک ڈلی نکالی۔

''اہا، یہ کہاں سے تمھارے ہاتھ لگ گئی؟ بھئی یہ بہت دلچسپ بات ہے؛ یہ واقعی بہت دلچسپ بات ہے،'' بوریا کے رہنے والے ایک آدمی نے، پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ، کہا۔ ''ذرا مجھے تو سونگھنے دو۔ کیا یہ اصلی چیز ہے؟''

اسے چاکلیٹ سونگھنے دیا گیا۔ ساری آنکھیں چاکلیٹ پر، روپہلی پنّی پر جمی ہوئی تھیں، جو اس طرح چمک رہی تھی جیسے جہنم میں کوئی ستارہ۔

سنجیدہ خاموشی میں، جس کے دوران میں ایک چبھتی ہوئی مذاقیہ بات یکا یک ٹپک پڑی، مالک نے اپنے ہر ساتھی کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر جیبی چاقو سے چاکلیٹ کا ایک ننھا سا ٹکڑا چھیل کر گرادیا، اور باقی ڈلی واپس اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔ ''بچوں کے لیے، سمجھے بھئی، اپنے بچوں کے لیے۔''

پھر اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے فوٹو نکالے۔ رفتہ رفتہ، ان سب نے بٹوؤں سے اپنے اپنے کنبوں کے افراد کے فوٹو نکال لیے۔ تصویریں دست بدست گھومنے لگیں۔ کہانیوں، بیانوں اور فجائی کلموں کی ایک گڈمڈ بھنبھناہٹ بلند ہوئی۔ آوازیں درد سے بھرائی ہوئی اور رکے رکے آنسو۔ گھر لوٹنے والوں کے پاس کچھ نہ تھا— اپنی آرزوؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔

رچرڈ نے چاکلیٹ کے مالک کو فوٹو واپس کیا۔ ''میرے پاس اپنی بیوی کی تصویر نہیں۔ ان تمام برسوں میں مجھے اکثر یہ افسوس ہوا کہ میں اپنے حافظے کو جھنجھوڑ کر یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کیسی شکل صورت کی ہے۔ لیکن اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

''پھر تم اسے مادر زاد حالت میں دیکھوگے،'' بوریا کے رہنے والے نے کہا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ اس کا سوٹ سیاہی مائل اور شہری، ہیٹ ملائم، داڑھی نوکیلی تھی، اور وہ پورے سفر میں سامان رکھنے کے کٹ گھر کو پکڑے ہوئے، کھڑا کھڑا، ہر آدمی سے گپ لڑاتا آیا تھا۔

دھچکوں کا ایک سلسلہ گاڑی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا گیا۔ وہ پھر کھڑی ہوگئی۔ وہ

اس کے عادی ہو چکے تھے۔ گفتگو جاری رہی۔ رچرڈ پھلانگتا ہوا گٹھریوں، ٹانگوں اور فرش پر بیٹھے ہوئے ساتھیوں پر سے گذرا۔ دروازہ ڈھیروں سامان سے رکا ہوا تھا، چناں چہ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کھڑکی کے راستے باہر نکلا۔

قریب قریب ہر ڈبے سے کوئی نہ کوئی اترا۔ اترنے والوں نے جمائیاں اور انگڑائیاں لیں، کوٹوں کے نچلے بٹن کھول دیے۔ پاخانوں تک میں لوگوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا، یا پھر ان کے دروازے سامان سے رُکے ہوئے تھے۔

رچرڈ نے احتیاط سے، لنگڑا کر، چند قدم رکھے۔ وہ اپنی چلنے کی صلاحیت آزما رہا تھا۔ روانگی سے تھوڑے دن پہلے ایک گاڑی کا پہیا اس کی ٹانگ پر سے گذر گیا تھا۔ سفر کرتے ہوئے اسے، رات دن، دو ہفتے ہو گئے تھے۔ جب اس نے اطمینان کر لیا کہ گاڑی کچھ دیر وہاں ٹھیرے گی تو وہ برف پر زور زور سے پاؤں رکھتا ہوا کچھ دور نکل گیا اور وہاں بیٹھ کر پتلون کا پائنچہ اوپر چڑھا لیا۔ اس کی ساری پنڈلی، ٹخنے سے گھٹنے تک، کچے آلوچوں کی طرح گہرے سبز رنگ کی ہو رہی تھی۔

باقی سب لوگ گاڑی پر سوار ہو چکے تھے۔ وہ، ایک سیاہ، بہت صاف سلہوٹ بنا، برف کی خیرہ کن پہنائی میں تنہا کھڑا تھا۔ چوڑے کندھے، ٹوپی سے چپراس ندارد، فوجی کوٹ ٹخنوں تک لمبا۔ اس کی بھنوؤں اور داڑھی کے جھاڑ جھنکاڑ سے، جس میں اس کی ناک کے سوا مشکل ہی سے کوئی چیز نظر آ رہی تھی، اس کی آنکھیں ایسے تنہا جانور کی آنکھوں کی طرح جھانک رہی تھیں جسے کسی ساتھی کی تلاش ہو۔

جب اس کی تاریک شکل بیسویں صدی کے نقل مکانی کے وسیلے کے نزدیک پہنچی تو وہ، جسے جنگ نے اگل دیا تھا، کالا، غلیظ، جوؤں سے بھرا، ژولیدہ مو، کوئی بچا کھچا قدیم انسان معلوم ہو رہا تھا، جو ابھی ابھی اپنے زیرِ زمیں بھٹ سے رینگ کر باہر آیا ہو۔

اس نے سوچا: دو گھنٹے میں میں وہاں، اپنے کمرے میں، اینا کے پاس پہنچ جاؤں گا، جس سے عین اسی وقت دائی یہ کہہ رہی تھی: ”تمھاری حالت بالکل ٹھیک ہے۔“ اگرچہ اینا نے کسی قسم کی بے اطمینانی محسوس نہ کی تھی تاہم کارل کی خواہشوں کے سامنے جھک کر اپنا معائنہ کروا لیا تھا۔

”تم تو کسی دلکش تصویر کے مانند ہو۔ اور میں اتنی عورتیں دیکھتی ہوں۔ میرے خدا، اگر انھیں اس بات کا پتا چل جائے! لیکن تم بڑی عمدہ، صحت مند عورت ہو۔ تمھیں دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی ہے،“ بڑھیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اینا صوفے پر ننگی اور گوری لیٹی ہوئی تھی، بھنے ہوئے سیبوں کی صاف خوشبو اس کے اچھی طرح گرمائے ہوئے کمرے کی ہوا میں بسی ہوئی تھی۔

رچرڈ کے بالوں کا سیاہ، ژولیدہ گولا کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اس نے اپنے لمبے بازو ڈبے میں

پھیلائے۔ اس کے ساتھیوں نے اسے اندر کھینچ لیا۔

شام سے ذرا پہلے ریل گاڑی مضافِ شہر کے مکانوں، اس فیکٹری کی لمبی، نیچی عمارت کے پاس سے گھڑ گھڑ کرتی گزری، جہاں کارل ابھی تک اپنی جگہ کھڑا کام کر رہا تھا۔

ڈبے میں جو لوگ تھے وہ سفر کے دوران میں ایک دوسرے گھل مل گئے تھے۔ انھوں نے بات چیت میں، اس وقت بھی جب روے سخن بالکل ادنیٰ مسائل کی طرف تھا، انتہائی گہری توجہ سے حصہ لیا تھا۔ وہ اب بھی آپس میں باتیں کرتے رہے۔ لیکن وہ اچٹتی نظریں ڈال اور ادھورے جواب دے رہے تھے۔ ہر کوئی ابھی سے غیر حاضر ہو چکا تھا، ہر کوئی ابھی سے خیال میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچا ہوا تھا۔

رچرڈ غیر معمولی جسمانی اور ذہنی استقامت کا مالک تھا اور واقعات، خواہ ان کی نوعیت خوشگوار ہو یا تکلیف دہ، بشرطیکہ وہ چند معین لیکن بے حد وسیع حدود میں رہتے، اس کی زور آور طمانیت کو متزلزل کرنے سے قاصر تھے۔

قیدیوں کے کیمپ کی روز روز کی، ختم نہ ہونے والی، اکثر سنگین اور ہمیشہ ذلت آمیز اذیتیں، جنھوں نے رفتہ رفتہ اس کے بہت سے ساتھیوں سے خود داری کی آخری جزئیات بھی چھین لی اور کچل دی تھیں، اسے ذرا متاثر نہ کر سکی تھیں۔ جب تک اسے اتنا ہی برداشت کرنا پڑتا جس کا وہ متحمل ہو سکتا، جب تک اس کے بوجھ میں ابھی ایک اور تنکے کا اضافہ ہو سکتا، اس وقت تک وہ یوں محسوس کرتا رہتا اور ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیتا جیسے سرے سے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

صرف ایک دفعہ اس کے اندر کا ٹھوس بند یکا یک ٹوٹ گیا تھا۔ وہ دن بھر کی سخت محنت کے بعد، بہت بھوکا کیمپ لوٹا تھا۔ پہرے دار بارک میں آیا۔ بلاوجہ اور کچھ کہے بغیر، اس نے رچرڈ کے ہاتھ سے برتن چھین لیا، کھانا کا لے، پامال فرش پر پھینک دیا، اشارہ کیا، اور دہاڑا: ''کھا!... سؤر، کھا!... بیٹھ جا اور کھا لے!'' اور رچرڈ کے منھ پر تھپڑ مارا۔

تب بھی رچرڈ کے جذبے نے خود کو ظاہر نہ کیا۔ لیکن اچانک اس کی حالت اس مشین جیسی ہو گئی جو ایک بیرم کو ہلکے سے چھونے سے گیئر سے باہر ہو گئی ہو، اور پہلے کی طرح چلتی تو رہے، مگر کٹ کر جدا ہو چکی ہو۔

یوں وہ باہر نکلا اور نہ تو معمول سے تیز اور نہ آہستہ چلتا ہوا، کھلی جگہ پار کر کے ٹول شیڈ پہنچا اور اپنا کدال اٹھا لایا۔ یہ اس پر بالکل واضح تھا کہ پہرے دار کو ہلاک کرنے کے آدھے گھنٹے بعد اسے گولی سے اڑا دیا جائے گا، لیکن یہ بات اس کے لیے اب کوئی وزن نہ رکھتی تھی۔ یہ پہرے دار کا معاملہ تھا: اسے مردم آزاری کو اس انتہا تک نہ پہنچانا چاہیے تھا۔ اب اَور کچھ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ اَور کچھ کرنے کا موقع نہ تھا۔ یہ عیاں تھا

کہ اسے پہرے دار کو ضرور ہلاک کر دینا چاہیے، بالکل جیسے یہ بھی عیاں رہ چکا تھا کہ اسے دوسری اذیتوں کو، محض حقائق سمجھ کر، کوئی اثر قبول کیے بغیر سہنا چاہیے۔

جب وہ واپس آیا تو پہرے دار جھونپڑے سے جا بھی چکا تھا۔ پہرے دار اور رچرڈ کی جان محض اس لیے بچ گئی کہ اتفاق سے اسی رات اس آدمی کا کسی اور جگہ تبادلہ ہو گیا۔

جب آخر کار ریل گاڑی گھڑ گھڑ کرتی اسٹیشن میں داخل ہوئی اور ٹھہر گئی تو رچرڈ اس ٹھس، طاقتور طمانیت کے ساتھ، جو اس کی ذات کا اتنا ہی حصہ تھی جتنا کہ اس کا جسمانی وجود، اپنے ساتھیوں سے رخصت ہوا اور اپنی بھوری گٹھری بغل میں داب کر تن تنہا اور لنگڑاتا ہوا اسٹیشن کا چوک پار کرنے لگا؛ یہ وہ گھڑی تھی جب اینا اپنے اور کارل کے لیے، جو اَب اپنی دور افتادہ فیکٹری سے روانہ ہو رہا تھا، میز پر کھانا چن رہی تھی۔ رچرڈ کا انبساط اور اشتیاق تک اسے زیادہ تیز چلنے پر مجبور نہ کر سکا۔ چار سال وہ اینا کے لیے ترستا رہا تھا اور اس مدت میں انتظار کرنا سیکھ گیا تھا۔ اب وہ گویا اینا کے پاس ہی تھا۔ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا تھا۔ جو کچھ وہ ابھی سے محسوس کر رہا تھا اصل ملاقات اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہ کر سکتی تھی۔

صرف ایک قطعی خلافِ عادت شگفتگی، متلون اور غیر محسوس اور چڑیا کے پروں کی طرح ہلکی، رچرڈ کے بھاری بھر کم تیقن کے گرد پھڑ پھڑا رہی تھی، جیسے کسی ہاتھی کے گرد ایک تتلی۔

راستہ لمبا تھا۔ ان دنوں ٹرامیں نہیں چل رہی تھیں۔ کارل کو فیکٹری سے بلڈنگ تک جو راستہ طے کرنا پڑتا تھا، وہ کوئی ایک تہائی زیادہ طویل تھا، لیکن وہ پھرتی سے ڈگ بھرتا آرہا تھا اور اس کی ٹانگیں بالکل تندرست تھیں۔

اینا نے میز پر کھانا چن دیا اور کچھ ڈبل روٹی خریدنے نیچے چلی گئی۔ شام کے قریب، جب وہ سمجھ لیتی کہ کارل آنے ہی والا ہو گا، تو ہمیشہ زیادہ پر سکون ہو جاتی۔

ایک پیچھے سے کھلے ہوئے خالی ٹھیلے نے، جسے دو طاقتور گھوڑے کھینچ رہے تھے، رچرڈ کو رستے میں آلیا۔ ٹھیلے والا رک گیا اور اس نے لنگڑا کر چلتے ہوئے گھر آنے والے سے پوچھا کہ کیا وہ سواری لینا پسند کرے گا۔ رچرڈ ہاتھ پاؤں ٹیک کر پیچھے چڑھ گیا۔ گھوڑے آہستہ آہستہ ڈُلکی چال چلنے لگے۔

راستے کا آخری ذرا سا حصہ اسے پیدل طے کرنا پڑا۔ سڑک پر کھلنے والے دروازے میں موٹر مستری میری کے ساتھ کھڑا تھا۔ رچرڈ نے بلڈنگ کا توجہ سے جائزہ لیا۔ چار سال پہلے وہ نئی تھی؛ اب اس کا اگلا رخ تغافل اور بوسیدگی کا شکار تھا۔

''کیا آپ بلڈنگ میں کسی کو تلاش کر رہے ہیں؟'' موٹر مستری نے پوچھا، اور اینا کی آسانی سے بھڑک اٹھنے والی سہیلی نے گھبرا کر آشفتہ حال سپاہی پر پھسلتی ہوئی نظر ڈالی جو لوہے کی طرح سخت اور طاقت

سے لبریز معلوم ہورہا تھا، اور اس کے باوجود جنگ کے برسوں کے بے حساب بوجھ کے نشانات اس پر موجود تھے۔

رچرڈ کی خلاف معمول شگفتگی نے اس سے کہلوایا، "ہاں، ہاں، اپنی بیوی کو۔" اور اس نے اینا کا نام لیا۔ "وہ اب بھی یہیں رہتی ہے، رہتی ہے نا؟"

"ہاں، مگر..." میری نے گڑبڑا کر کہنا شروع کیا، اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے۔

"... مگر فراؤ اینا ایک وقت میں ایک ہی آدمی کی بیوی ہو سکتی ہے، دو کی نہیں،" ایک نوجوان کاریگر نے، بشاشت سے دانت نکال کر، میری کا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ وہ دروازے میں کھڑا تھا، اور رچرڈ اس کے پاس سے گذر چکا تھا۔

جب وہ تھکا ہارا، میلا کچیلا، قدرے خمیدہ، لمبا کوٹ پہنے جو سیڑھیوں کو چھو رہا تھا، لنگڑاتا ہوا اوپر چڑھا تو ایسا لگا جیسے وہ چار برس تنہائی اور دہشت، نامرادی اور دل فگاری کے عالم میں، اکیلا، پیادہ پا، مارا مارا پھرتا رہا تھا، اور ابھی ابھی اس جگہ پہنچا تھا۔

اینا نے اس کی بھاری، لنگڑاتی ہوئی چاپ سنی، جس کی آواز ایسی تھی جیسے دو آدمی سیڑھیوں کے راستے کوئی بوجھ گھسیٹ کر اوپر لا رہے ہوں۔ وہ اس قدر خوبصورت اور تابناک معلوم ہو رہی تھی جیسی کہ عورتیں بعض اوقات زچگی سے پیشتر معلوم ہوتی ہیں۔

اس نے دستک نہ دی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک کالا، اجنبی آدمی دروازے میں کھڑا تھا۔

دونوں چپ رہے۔ اینا نے، ٹکٹکی باندھ کر، خاموشی سے اس سے سوال کیا۔

چاروں طرف سرسری نظر ڈال کر اس نے سارے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ "ارے، اینا، تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

اینا نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ اسے سڑک پر بھی نہ پہچان سکتی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ رچرڈ تھا— ضرور ہوگا! اینا نے محسوس کیا کہ اس کا لہو ہاتھوں پیروں سے اوپر کی طرف کھنچا جا رہا ہے، اور اپنی کھال کے نیچے ایک گرم سلسلاہٹ کا احساس ہوا۔

رچرڈ اس کے قریب گیا اور اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اینا نے اپنی برف جیسی انگلیاں اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ اور پھر رچرڈ نے بلا ثبوت یہ طے کر لیا کہ ان کا رشتہ بدستور استوار ہے۔ بالوں کا ایک جنگل، جس میں ایک منہ ضرور چھپا ہوا ہوگا، اینا کے چہرے کی طرف بڑھا۔ اینا کا سر از خود دوسری طرف مڑ گیا۔

"بہت گندا ہوں؟ ہاں، سفر کی وجہ سے!" تب کہیں اس نے اپنی گٹھری نیچے رکھی، اسی کرسی پر جس پر مہینوں پہلے کارل نے اپنی پوٹلی رکھی تھی، کوٹ اتارا، اور یکایک اس تضاد سے آگاہ ہو کر جو میل کی اس لمبی،

موٹی تہہ اور بے داغ کمرے کے درمیان موجود تھا، اسے کالر سے پکڑ کر اٹھائے رکھا: اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوٹ کا کیا کرے۔

اس خوب مزے سے گرم، آرام دہ، نہایت صاف ستھرے، حیرت انگیز گھر میں رہنے کی توقع پر، آئندہ کی خوشی کا پہلے سے مزہ چکھنے سے چمک اٹھنے کے بعد اس کی نظر ایک دفعہ اور پورے کمرے میں گھوم گئی۔ اس کی آنکھیں اینا پر جم گئیں اور خوشی اس پر غالب آگئی۔ ''اچھا، اینا، بی اینا! تم ایک طویل مدت تک انتظار کرتی رہی ہو اور اب، جب کہ انتظار ختم ہو گیا ہے تو حیران ہو۔''

اور اینا، جس نے ہزار مرتبہ یہ تہیہ کیا تھا کہ وہ رچرڈ کو فوراً، پہلے ہی منٹ میں، سب کچھ بتا دے گی، اسی اینا نے چپ سادھ کر جھوٹ بولا۔ وہ چھری نہ پھیر سکی۔ جو کچھ پیش آ چکا تھا اس کی پوری اور ہول خیز سنگینی، مہینوں، دن رات، رچرڈ کی واپسی کے بارے میں سوچتے رہنے کے باوجود، اینا کے دل میں اس وقت تک نہ اتر سکی جب تک وہ حقیقت سے دوچار نہ ہو گئی۔

اینا کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ کوئی لفظ ایسا نہ تھا جسے وہ زبان پر لا سکتی۔ اب کچھ نہ رہا تھا جس کے واسطے لڑا جائے۔ رچرڈ متحیر ہو کر اینا کو، جو کسی جی اٹھنے والی اور چلتی پھرتی لاش کی طرح اینٹھی ہوئی تھی، دروازے کی جانب اور پھر باہر جاتے ہوئے دیکھا کیا۔

سیڑھیاں اتر کر صحن کو بھاگ کر پار کرتی ہوئی، بڑی سڑک پر آ گئے کو: کارل کی طرف۔

جو، چوں کہ ٹرامیں نہیں چل رہی تھیں اس لیے، راہ مختصر کرنے کی غرض سے ایک بغلی سڑک سے گھر آ رہا تھا اور اس وقت مڑ کر بڑی سڑک پر پہنچا جب اینا نظر سے اوجھل ہو چکی۔

وہ نوجوان کاریگر جس نے کہا تھا کہ فراؤ اینا صرف ایک ہی مرد کی بیوی ہو سکتی ہے، ابھی تک دروازے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا، اور اس نے متجسس مسکراہٹ کے ساتھ کارل کو اندر جاتے دیکھا۔ ''اب کیا ہوگا؟'' اس نے اپنے دو ساتھیوں سے پوچھا، جنھیں وہ پہلے ہی یہ قصہ سنا چکا تھا۔ اس وقت تک بلڈنگ میں متعدد لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ایک سپاہی واپس آیا ہے جسے دعویٰ ہے کہ اینا اس کی بیوی ہے۔

جب کارل نے جلدی جلدی قدم اٹھا کر صحن پار کیا تو پڑوسی کھڑکیوں میں کھڑے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

جس وقت سے رچرڈ کی واپسی کے خیال نے قسمت کے لکھے کی طرح ان کے سروں پر منڈلانا شروع کیا تھا، دونوں پریمی ایک دوسرے سے اتنے قریبی طور پر وابستہ ہو کر کہ چھوٹی سے چھوٹی خدمت بھی محبت کا اعلان بن جاتی تھی، ایک ایسی غیر حقیقی دنیا میں رہنے لگے تھے جس میں کوئی چیز اور کوئی آدمی داخل نہ ہو سکتا تھا۔

پہلی منزل پر پہنچ جانے کے بعد کارل ہمیشہ، اس بارے میں کبھی غور کیے بغیر کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے، اپنی رفتار آہستہ کر لیتا تھا اور آج بھی اس حرکت نے اس فوری احساس کو جنم دیا کہ اینا اشتیاق سے اس کی منتظر ہے۔

کارل نے، ابھی اسی یقین میں کہ وہ اس کے قدموں کی آواز سن چکی ہے، اور اسی کی طرح، اندر ہی اندر پگھلتی ہوئی، اس کے خیر مقدم کے لیے اپنی محبت کو آگے بھیج رہی ہے، دروازہ کھولا۔

اس کے احساس میں جو تبدیلی آئی اس کا، شدت اور اچانک پن کے لحاظ سے، صرف اس آدمی کے احساس سے مقابلہ ہو سکتا ہے جو لمحے بھر کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلے اور واپس جائے، اور، دہلیز پار کرتے ہی، خلا میں گر پڑے کیوں کہ اتنی دیر میں فرش غائب ہو چکا ہو۔

''تم؟'' رچرڈ نے حیرت سے پوچھا۔ لیکن اس کی استقامت ابھی قائم تھی۔ اس نے ایک میلی قمیص کو اپنی کھلی ہوئی گٹھری میں واپس گرا دیا۔ ''عجب بات کہ تم سے پھر ملاقات ہو گئی، اور اتنی جلدی!... میں بتاؤں، مجھے یہاں آئے ہوئے فقط تین منٹ ہوئے ہیں... مگر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یا وہاں، صوفے پر۔''

کسی چیز نے کارل کو یہ پوچھنے سے باز رکھا کہ اینا کہاں ہے۔ وہ بیٹھ گیا۔ صوفے پر۔

اب بھی وہی بمشکل محسوس ہونے والی خوش آئند شگفتگی، ایسی جو صرف ایک بھاری بھرکم، آہنی مرد کے حصے میں اس وقت آ سکتی ہے جب وہ بے انتہا محنت مشقت کے بعد، آخر کار، بالکل غیر مغلوب، اپنی منزل پر پہنچ گیا ہو۔

''تو کیا تم یہاں رہتے ہو؟... کچھ کھایا تم نے؟ تم کب واپس آئے؟ وہ ابھی یہاں آ جائے گی، پھر وہ ہمیں کھانا کھلائے گی، کھانا بالکل تیار ہے۔''

اس نے دبی دبی مسرت سے، جیسے کوئی بچہ اپنے تحفے لیے کرسمس کی دعوت میں موجود ہو، میز پر ترغیب دلانے والے انداز میں چنے ہوئے کھانے کی طرف، اور پھر کندھے کے اوپر سے کارل کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو: دیکھا، اب میں کس ٹھاٹ سے رہتا ہوں۔ یہ اینا ہے۔ بس ہر چیز کی کمی پوری ہو گئی۔

جتنی دیر کارل رچرڈ کو اپنی گٹھری خالی کرتے، ان کپڑوں کو جو ابھی صاف تھے پیٹی کی دراز میں اور میلے کپڑوں کو کونے میں رکھی ہوئی کرسی پر رکھتے دیکھتا رہا، اس کے دل پر دباؤ بتدریج بڑھتا رہا۔

''اینا کو انھیں فوراً دھو ڈالنا چاہیے۔ ان کو قاعدے سے سوڈے کے ساتھ ابالنا ضروری ہے۔'' پل بھر کو سوچ میں پڑے بغیر رچرڈ نے، جو کمرے سے اور اس میں رکھی ہوئی چیزوں سے بخوبی آشنا تھا، پیٹی کی اوپر والی دراز باہر کھینچی اور اپنے کاغذات دائیں کونے میں رکھ دیے، جہاں وہ ہمیشہ رکھے رہتے تھے۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ، اپنا کوٹ اتاردو... یہ اچھی بات ہے کہ تم بھی یہیں ہو۔''

چوں کہ وہ ایسی حرکات کررہا ہے جیسے کہ میزبان ہی ہے، اس لیے میں اینا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکتا... اب مجھے چاہیے کہ اسے سب کچھ بتادوں۔ اب مجھے اسے بتادینا چاہیے۔

اس تہیے نے فوراً اس کے باطنی فالج کو رفع کردیا۔ تمام احساسات غائب ہوگئے۔ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے، اس نے سوچا، اور یکا یک ہرنس میں چست اور برف کی طرح سرد ہوگیا، جیسے وہ آدمی، جو یہ ٹھان کر کہ یا تو اپنے مدمقابل کو ہلاک کردے گا یا خود مارا جائے گا، ڈوئل لڑنے کے لیے اپنی جگہ پر آ کھڑا ہوتا ہے۔

''لو، اینا آگئی،'' اس نے کہا، اور اٹھ کھڑا ہوا۔

رچرڈ نے اس قعر کو محسوس نہ کیا جو اس لہجے نے وا کردیا تھا جس میں یہ چار لفظ ادا کیے گئے تھے۔

پسینے میں نہائی ہوئی، آنکھیں پھٹی پھٹی اور دیکھنے سے قاصر، بال پیشانی پر بکھرے ہوئے — یوں اینا گرتی پڑتی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''کیا وہ یہاں ہے؟'' اس نے پہلے غلط سمت میں گھورا، پھر کارل کے بازوؤں میں گرگئی۔

جب کارل نے اینا کو سینے سے لگایا تو اسے برفانی ٹھر کے نیچے خوشی کے ایک دہکتے ہوئے نقطے کا احساس ہوا۔ رچرڈ، خوف زدہ لیکن ابھی تک بدگمانی سے پاک، ان کے قریب آیا۔ ''کیا بات ہے؟ کیا تمھاری طبیعت خراب ہے؟''

اینا میں اتنی طاقت آگئی کہ خود کو چھڑا سکے۔ وہ بوکھلائی ہوئی اور بدحواس، بالکل سامنے نظریں جمائے، دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

کارل کو ایسا لگا جیسے وہ گولی چلارہا ہو، جب اس نے یہ کہا، ''تمھیں اینا کو چھوڑنا پڑے گا۔''

یہ رچرڈ کی سمجھ میں نہ آسکا۔ کارل کی بات بڑی دور سے آئی تھی اور اسے رچرڈ تک پہنچنے کے لیے طویل عرصہ درکار تھا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھی، ابھی اس تک نہ پہنچی تھی کہ اس نے سوچا: اگر وہ اینا کے ساتھ سوچکا ہے تو میں انھیں مار مار کر نیچے گرادوں گا، دونوں کو، اور پھر وہ بہت جلد اٹھنے نہ پائیں گے۔ اور اینا کو بالکل ہی کھو بیٹھنے کے شدید خوف سے وہ دل کی اگلی دھڑکن کے ساتھ، معاف کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا، اور ابھی سے دوبارہ پرسکون ہوکر، سوچا: کارل فضول باتیں کررہا ہے — آپ ہی آپ خام خیال باندھ رہا ہے۔ ''چلو، منھ سے بولو، اینا، کیا بات ہے؟... اینا!''

کوئی جواب نہیں۔ وہ اینا کی طرف بڑھا۔ کارل دونوں کے بیچ میں آگیا۔ ''اینا میری بیوی ہے۔ میں ہر بات تمھیں سمجھادوں گا۔''

یکا یک رچرڈ کو نظر آیا کہ اینا حاملہ ہے۔ ''اوہ، یہ بات ہے؟... اب مجھے سمجھانے کے لیے کیا رہ گیا ہے، سوٗر!'' لیکن اسی دل جمعی کے ساتھ جس کا ثبوت اس نے قیدیوں کے کیمپ میں اس وقت دیا تھا جب وہ اپنا کدال لانے کے لیے بارک سے نکلا تھا۔

وہ ایک دفعہ اینا کے ساتھ سو چکا ہے، اینا ایک دفعہ اس بات کی مرتکب ہو چکی ہے، اور اب اس کے بچہ ہونے والا ہے۔ اور وہ مجھے یہ بات سمجھانا چاہتا ہے، سوٗر! جہاں تک اینا اور اس کے حمل کا تعلق ہے، مجھے اسے قبول کرتے ہی بنے گی۔ ہمیں اس دشواری پر قابو پانا ہی پڑے گا۔ لیکن جہاں تک کارل کا تعلق ہے، اتنا ہی کافی ہے اور بہت زیادہ ہے! رچرڈ کو پتا تھا کہ کلہاڑا کہاں رکھا ہے اور اس نے اسی کونے کا رخ کیا۔

جس وار کے ہاتھوں اسے ڈھینا تھا وہ غیر متوقع طور پر، اور بالکل مختلف جانب سے ہوا، اینا اس کی طرف جھپٹی۔ ''میں اس کے سوا کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے مار ڈالو! یہ بات بس ایسے ہی ہو گئی تھی، رچرڈ، یہ بات بس ایسے ہی ہو گئی تھی!''

''اس کے سوا کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتیں؟ تم اس کے سوا کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتیں؟... تمھیں میری ضرورت نہیں؟ کیا تمھیں میری ضرورت نہیں؟''

''اب میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

یہ اس سے زیادہ تھا جتنا وہ قبول کر سکتا تھا، اس سے زیادہ تھا جتنا وہ سہہ سکتا تھا۔ اب وہ وار نہ کر سکتا تھا۔ وہ، کاٹ کر گرائے ہوئے درخت کی طرح، اندر ہی اندر ڈھیر ہو گیا۔

وہ، اس بات پر یقین لانے سے قاصر، میز کے پاس بیٹھ گیا۔ ''تم نہیں رہ سکتیں؟... کیوں نہیں، اینا کیوں نہیں؟... تم نہیں رہ سکتیں، اینا؟ تم صرف اسی کو پسند کرتی ہو؟''

وہ چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کی روشنی کی خاطر، جب کہ وہ گل بھی ہو چکی تھی، جدوجہد جاری رکھے۔ ''بتاؤ، کیا بات ہے؟ مجھے سمجھاؤ، مجھے سمجھاؤ،'' اس نے، کھو کر، کہا۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھنا شروع کیا۔ ''اچھا، مجھے ضرور... مجھے ضرور...'' اسے پتا نہ تھا کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ وہ پھر کرسی میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک لفظ بھی منھ سے نہ بولا۔

ان دونوں نے رچرڈ کی طرف دیکھا جو، پریشان حال اور میل کچیل کی وجہ سے اکڑا اکڑا، وہاں دبکا ہوا تھا، جس کے تمام سہارے چھن چکے تھے، ایک مرد جو بچپن میں یہ بھول گیا تھا کہ روتے کس طرح ہیں، اور اب کمر جھکائے بیٹھا ہوا، خشک آنکھوں سے خلا میں تک رہا تھا — اور دردمندی نے انھیں دو نیم کر دیا۔ اسی لمحے ان کا خوف دور ہو گیا۔

اینا نے کارل کی آواز سنی، جو کہہ رہی تھی، ''اب ہمیں چلے جانا چاہیے،'' اور وہ چند ایک چیزیں ایک

دستی بیگ میں تہہ کرکے رکھنے لگی۔

اینا کو اکثر رچرڈ کے پاس سے گزرنا پڑا۔ اس کی نگاہیں اکثر رچرڈ پر جمی رہیں، اور اس کے باوجود یہ خیال ہرگز اس کے ذہن میں نہ آیا کہ وہ اپنی دردمندی کے آگے جھک کر رچرڈ کے پاس رہ جائے۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی چیز اتنی ظالم نہیں، اتنی ظالم نہیں، جتنی کہ محبت ہے، جس میں عالی ظرف ارادت مندی، بلکہ مکمل خودسپردگی تک، انتہائی سفاک انانیت کے پہلو بہ پہلو موجود نظر آتی ہے۔

میری نے دروازے پر دستک دی، ایک سہمی سہمی دستک، اور سہمی سہمی اندر داخل ہوئی۔ اس نے اینا کا ہاتھ بٹایا، اور اس بے دردی سے دی گئی بھاری سزا کی گواہ بنی۔

وہ درازیں کھولتے، سامان باندھتے، ادھر ادھر پھرتے رہے۔ رچرڈ نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ اینا کے ساتھ گزرے ہوے ماضی کے منظر اس کی چشمِ تصور کے سامنے آ جا رہے تھے۔ ہر چیز اتنی پرلطف ہوا کرتی تھی۔ اس نے حرکت کی، اپنا سر اور کندھے اٹھائے، جیسے وہ دوبارہ سوال کرنے، دوبارہ کوشش کرنے کا خواہش مند ہے؛ اس کا سر خاموشی سے جھک گیا۔

اینا کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس نے دستی بیگ نیچے رکھا۔ ''رچرڈ۔'' اور بیگ دوبارہ اٹھا لیا۔

''بس، جاؤ،'' رچرڈ نے کہا، اور پہلی دفعہ، داڑھی کے جھاڑ جھنکاڑ کی اوٹ سے، اس کا منھ پورا کھلا ہوا نظر آیا۔

اینا کی ہمت نہ پڑی کہ رچرڈ سے ہاتھ ملائے۔ اس نے بےبسی سے کارل اور میری کی طرف دیکھا، اور دروازے کا رخ کیا۔

کارل کی حالت اس وکیل جیسی تھی جس نے ایسے آدمی کی طرف سے مقدمہ لڑا ہو جسے موت کا حکم سنا دیا گیا ہو اور وہ ایک صبح، سزاے موت کی تعمیل سے گھنٹہ بھر پہلے، اپنے موکل سے ملنے جائے اور رخصت ہوتے وقت اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ آیا ''خدا حافظ'' کہے یا ''صبح بخیر'' یا کس طرح وداع ہو۔ وہ کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔ میری کے ملائم ہلکے یکساں رنگ کے، شفتالو جیسے رخساروں پر، جو پہلے ہی رونے سے خوب بھیگ چکے تھے، آنسو تیزی سے پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہے تھے۔

دوسری منزل کے زینے کے چبوترے پر ایک مرد اور کئی عورتیں کھڑی تھیں؛ جب دونوں پرے ہی پاس سے گزرے تو انھوں نے کچھ نہ کہا۔ ان پڑوسیوں نے جو دوسرے صحن کے دروازے میں کھڑے جوش و خروش سے اس معاملے پر بحث کر رہے تھے، ایک طرف ہٹ کر، ان دونوں کو گزر جانے دیا اور پیچھے پیچھے چل پڑے۔

بچوں کی بھیڑ اور دونوں دھوبن چڑیاں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور سردی سے نیلی، جلوس میں شامل

ہوگئیں۔ کھڑکیوں میں طیش آلودہ چہرے۔ جوشیلی چیخوں اور گالی کے پہلے لفظ نے ان توہین آمیز کلمات کا جھاڑ باندھ دیا جو بعد میں کہے گئے۔

بلڈنگ کے باسی، جنھوں نے شادی شدہ عورتوں کے کھلم کھلا ناجائز تعلقات میں خلل ڈالنا تو ایک طرف، ان پر توجہ بھی مشکل سے دی تھی، اینا کی چالاکی اور فریب سے تلخ کام ہوگئے تھے جس کی مدد سے وہ چھ مہینے تک تمام اڑوس پڑوس کے اعتماد اور سریع الاعتقادی سے بے جا فائدہ اٹھانے میں کامیاب رہی تھی۔

جذبات میں بہہ کر، چیخ پکار اور گالیوں سے متنفر میری نے رندھی ہوئی آواز میں اس ہجوم سے چیخ کر کہا جو رخصت ہونے والے پریمیوں پر پلا پڑ رہا تھا: ''وہ خود یہی سمجھی تھی کہ وہ اس کا شوہر ہے۔''

بہت سی آوازوں کے جلے کٹے فقرے اور قہقہے بیرونی دروازے کی دیواروں سے ٹکرائے۔ یوں وہ عمارت سے باہر پہنچے۔ دستی بیگ کارل نے اٹھا رکھا تھا۔

برف میں آگے ہی آگے۔ کچھ وقت گزر گیا تب کہیں پہلے ان چند تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھٹا جو آگے تک آگئے تھے۔ نیم بالغ چھوکرے ابھی پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ایک نے برف کی گیند بنائی اور دونوں پریمیوں کی طرف پھینکی۔ اس کے بعد وہ بھی، پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور کندھے اچکاتا، آہستہ آہستہ دوڑتا واپس چلا گیا۔

''اس کے پاس واپس جاؤ، میری؛ اس کے پاس واپس جاؤ!'' اینا نے منت کی۔

میری پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ وہ رچرڈ کو تنہا نہیں رہنے دے گی۔ دس قدم اور، اور پھر وہ رک گئی، اس کی فطری شگفتگی عود کر آئی تھی اور اس نے، کہ پوری طرح ہوش و حواس میں اور زندہ سلامت ہونے کی وجہ سے خوش تھی، پکار کر کہا، ''اینا! خدا حافظ، اینا!''

وہ اس چوڑے، خالی علاقے میں پہنچ گئے جو شہر اور مضافاتی آبادی کے درمیان واقع تھا۔ گہری، تازہ برف نے، جو ابھی پامال نہ ہوئی تھی، ان کے بے آواز قدموں کی پیشوائی کی۔

وہ مڑ کر دورویہ درختوں سے گھری اس سڑک پر پہنچے جہاں کارل نے لق و دق میدان میں لیٹے لیٹے، اینا کو انتظار کرتے دیکھا تھا۔ چاند اور برف سے رات منور تھی۔ منجمد شاخیں سفید سطح پر مڑے تڑے بیل بوٹوں کی شکل کے سائے ڈال رہی تھیں۔ ستارے سرد رُوئی سے جگمگا رہے تھے۔

انھوں نے کچھ نہ کہا؛ انھوں نے کچھ نہ سوچا۔ وہ ایک اتھاہ اسرار میں چلتے رہے، اور مرتے دم تک کوئی چیز انھیں جدا نہ کر سکی۔

ارسلا لے گون

وہ جو شہر چھوڑ جاتے ہیں

(ولیم جیمز کا ایک موضوع قدرے ردو بدل کے بعد)

گھنٹیوں کا غلغلہ بلند ہوتے ہی، جسے سن کر ابابیلیں پُھر سے اڑ گئیں، سمندر کنارے بسے، جگمگاتے میناروں والے شہر اومیلاس میں موسم گرما کا تہوار آ گیا۔ بندرگاہ میں کھڑی کشتیوں کے مستول، بادبان تاننے والے رسے رسیاں جھنڈیوں سے جھم جھم کر رہی تھیں۔ جلوس، سرخ چھتوں اور رنگ برنگی دیواروں سے گھری سڑکوں پر، پرانے کائی لگے باغوں میں ہوتے ہواتے، دو رویہ درختوں کی چھاؤں سے پٹے راستوں سے، بڑے بڑے رمنوں اور عماراتِ عامہ کے سامنے سے گزرتے رہے۔ بعضے جلوس ادب دار تھے۔ معمر لوگ بھورے اور ارغوانی رنگوں کے لمبے لمبے اکڑے لبادے پہنے، سنجیدہ استاد کاریگر، بالکل چپ چاپ، ہنسوڑ عورتیں اپنے اپنے بچے بالے گود میں اٹھائے، بتیاتی ہوئیں۔ دوسری سڑکوں پر موسیقی کی لے، طنبوروں اور گھڑیالوں کی لہک کی صورت، تیز تر تھی اور لوگ ناچ رہے تھے۔ جلوس خود ہی ناچ تھا۔ لڑکے بالے پینترے بدل بدل کر جلوس میں جا گھستے، پھر باہر آ جاتے اور ان کی اونچی اونچی چیخ پکار، ابابیلوں کی پیچ در پیچ اڑانوں کے مانند، گانے بجانے کے شور سے بالا بالا سنائی دیتی۔ سب جلوس چکر پر چکر کھاتے شہر کی شمالی سمت رواں تھے، جہاں اس وسیع و عریض سبزہ زار میں، جو قطعات سبز کے نام سے موسوم تھا، لڑکے اور لڑکیاں، بھڑکیلی فضا میں چم ننگے، پاؤں، ٹخنے اور لمبی، لچکیلی بانہیں کیچڑ میں سنی ہوئیں، دوڑ سے پہلے اپنے بے چین راہواروں کو مشقیں کرا رہے تھے۔ گھوڑوں پر بغیر لگام کی باگ ڈور کے سوا کوئی ساز نہ تھا۔ ان کے ایالوں میں رو پہلے، سنہرے اور ہرے موباف گندھے تھے۔ وہ نتھنے پھلاتے، کلیلیں کرتے اور آپس میں اتراتے پھر رہے تھے۔ وہ بہت ہی جوش میں آئے ہوئے تھے کیوں کہ گھوڑا واحد جانور ہے جس نے ہماری ریت رسوم اپنالی ہیں۔ خلیج میں واقع اومیلاس کے گرد شمال اور مغرب کی طرف کے دور پرے پہاڑ ادھورا گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ صبح کا مطلع اس درجہ صاف تھا کہ وہ برف جو ابھی تک اٹھارہ چوٹیوں کے سر کا تاج

تھا، کوسوں پار تک دھوپیلی فضا میں آسمان کی گھور نیلاہٹ کے سائے تلے، اجلی سنہری آگ سا دہک رہا تھا۔ ہوا بس اتنی تھی جو گھڑ دوڑ کے میدان کی نشان دہی کرنے والی بیرقوں کو رہ رہ کر پھٹکارنے اور لہرانے کے لیے کافی ہو۔ کشادہ سبزہ زار کی خاموشی میں موسیقی کو سنا جا سکتا تھا کہ شہروں کی سڑکوں پر بل کھاتی، دور اور دور، اور قریب تر اور مسلسل نزدیک آتی جا رہی تھی۔ فضا میں ایک سرور، مدھم سی شیرینی جو وقتاً فوقتاً کپکپاتی اور سمٹ جاتی اور گھنٹیوں کی عظیم شادمان ٹھنٹھناہٹ بن کر پھٹ پڑتی۔

شادمان! شادمانی کے بارے میں بھلا کوئی کیا کہے؟ اومیلاس کے باسیوں کو کیسے بیان کرے؟ دیکھیے، وہ سیدھے سادے لوگ تو نہ تھے مگر خوش رہتے تھے، لیکن اب تو خوشی کے الفاظ ہم سے زیادہ ادا ہو نہیں پاتے۔ تمام مسکراہٹیں دقیانوسی ہو چکی ہیں۔ جب ایسا کوئی ذکر چھڑا ہوا ہو تو طبیعت چند باتیں فرض کر لینے پر مائل ہو جاتی ہے۔ جب ایسا کوئی ذکر چھڑا ہوا ہو تو جی میں آتا ہے کہ یہاں پہنچ کر بادشاہ سلامت کی تلاش میں نظر دوڑائی جائے جو ارجمند شہسواروں کی اردل میں کسی توسن پر سوار یا شاید کسی سنہرے میانے میں نیم دراز ہوں جسے قوی ہیکل غلاموں نے اٹھا رکھا ہو۔ لیکن وہاں بادشاہ کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ نہ تلواروں سے کام لیتے تھے نہ غلام رکھتے تھے۔ وہ جانگلو نہیں تھے۔ مجھے ان کے معاشرے کے قانون اور ضابطے تو معلوم نہیں مگر گمان ہوتا ہے کہ ان کی تعداد بہت ہی کم ہو گی۔ جس طرح وہ بادشاہت اور بردہ سازی کے بغیر کام چلا رہے تھے اسی طرح انھیں اسٹاک ایکس چینج، اشتہار بازی، خفیہ پولیس اور جوہری بم کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ تاہم مکرر عرض ہے کہ وہ نہ تو سادہ لوح لوگ تھے نہ میٹھے چرواہے، نہ شریف النفس وحشی تھے نہ خوش خلق یوٹوپیا پسند۔ وہ ہم سے کم پیچیدہ نہ تھے۔ مشکل یہ ہے کہ فیلسوفوں اور سوفسطائیوں کے ہوا دینے سے ہمیں ایک بری لت پڑ گئی ہے کہ خوشی کو قدرے احمقانہ چیز سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارے لیے صرف اذیت ہی عین دانشوری ہے؛ ہمیں صرف شر ہی دلکش نظر آتا ہے۔ یہ وہ غداری ہے جو فن کار نے کی ہے؛ اس نے شر کی پیش پا افتادگی اور اذیت کی ڈراؤنی اکتاہٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، یہ تلقین کی ہے کہ جسے نیچا نہ دکھا سکو اس سے نباہ کر لو، جس بات سے تکلیف پہنچتی ہو اس کو دہرائے جانے پر اکسایا ہے۔ لیکن مایوسی کے گن گانے ہوں تو مسرت کو ٹھکرائے ہی بنے گی۔ تشدد کو گلے لگانا ہو تو باقی سب چیزوں سے محروم ہونا ہی پڑے گا۔ ہم تقریباً محروم ہو ہی چکے ہیں۔ ہم اس قابل بھی نہیں رہے کہ لفظوں کی مدد سے کسی ہشاش بشاش آدمی کی تصویر ہی کھینچ پائیں یا کوئی جشن نشاط منا سکیں۔ میں آپ کو اومیلاس کے رہنے والوں کے بارے میں کوئی بات کیسے بتاؤں؟ وہ بھولے بھالے اور خوش باش بچے نہ تھے، اگرچہ ان کے بچے بالے، حقیقت یہ ہے، خوش و خرم رہتے تھے۔ وہ خود سیانے، زیرک، جوشیلے بالغ افراد تھے۔ ان کی زندگیاں درماندہ نہ تھیں۔ کیسی کرامات ہے! لیکن مجھے آرزو ہے کہ میں یہ بہتر طور پر بیان کر سکتی۔ مجھے آرزو ہے کہ میں آپ کو قائل

کر سکتی۔ میری عبارت آرائی سے تو اومیلاس پریوں کی کسی کہانی کا شہر معلوم ہوتا ہے جو سنتے آئے ہیں کہ مدتوں پہلے بہت دور کہیں پہ تھا۔ سب سے بہتر شاید یہی ہے کہ اسے ویسا ہی متصور کر لیں جیسا کہ آپ کی خیال آفرینی، بہ شرطے کہ وہ اس موقعے پر آڑے آجائے، آپ کو دکھانا چاہے، کیوں کہ یہ طے ہے کہ میں آپ سب کی تشفی نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر ٹیکنالوجی کا کیا کیا جائے؟ میرے خیال میں وہاں نہ تو سڑکوں پر کاریں ہوں گی نہ فضا میں ہیلی کاپٹر نظر آئیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل اومیلاس بڑے زندہ دل ہیں۔ خوشی کا انحصار اس امر پر ہے کہ آدمی بے لاگ طور پر یہ امتیاز کر سکے کہ کون سی چیز ضروری ہے، کون سی نہ تو ضروری ہے اور نہ تباہ کن اور کون سی تباہ کن ہے۔ بہر کیف، درمیانی زمرے میں — جس میں آسائش، تعیش، ریل پیل وغیرہ جیسی غیر ضروری غیر تباہ کن باتیں شامل ہیں — وہ شوق سے مرکزی تمازت، زیر زمین ریل گاڑیوں، کپڑے دھونے کی مشینوں اور ہر قماش کی عجوبہ چیزوں کو، جو ابھی یہاں ایجاد نہیں ہوئیں — مثلاً فضا نورد روشنیاں، ایندھن کے بغیر حاصل ہونے والی توانائی، زکام کا تیر بہدف علاج — کام میں لا سکتے ہیں۔ یا ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس نہ سہی، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ جو آپ کی مرضی۔ میرے جی میں تو کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ تہوار سے پہلے کے چند دنوں میں ادھر ادھر کے ساحلی قصبوں سے لوگ چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹرینوں اور دو منزلہ ٹراموں میں اومیلاس پہنچتے رہے ہیں اور یہ کہ اومیلاس کا ریلوے اسٹیشن در حقیقت شہر کی خوب صورت ترین عمارت ہے، گو کاشتکاروں کے بازار کے شکوہ کے سامنے ذرا پھیکا پڑ جاتا ہے۔ لیکن ٹرینوں کا وجود اگر فرض کر بھی لیا جائے تو بھی مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میں سے بعض کو اومیلاس ایسا لگے گا جیسے پارسائی کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہو۔ مسکراہٹیں، گھنٹیاں، صف آرا جلوس، گھوڑے، اونہہ! اگر ایسا ہے تو براہ کرم اپنی طرف سے کسی جشن بدمستی کا اضافہ کر لیجیے۔ اگر جشن بدمستی سے کام بنتا ہو تو ہچکچایئے مت۔ بہر حال، ہمیں ایسے مندر دکھانے منظور نہیں جہاں سے حسین و جمیل ننگ دھڑنگ پجاری یا پجارنیں، پہلے ہی سے نیم مست، برآمد ہوں اور ہر کسی سے، خواہ مرد ہو یا عورت، آشنا ہو یا اجنبی، جو لہو کی عمیق الوہیت سے وصال کا متمنی ہو، جفت ہونے پر آمادہ ہو جائیں۔ گو پہلے پہل مجھے یہی کچھ سوجھا تھا لیکن در حقیقت بہتر یہی ہے کہ اومیلاس میں مندر — کم از کم آباد مندر — دکھائے ہی نہ جائیں۔ مذہب ہو، ملا یا پنڈت نہ ہوں۔ بے شک وہ خوب صورت ننگی عورتیں، ضرورت مندوں کی بھوک مٹاتی اور جسم کی سرمستی کی خاطر خود کو آسمانی نمش کی طرح پیش کرتی، اہلی گہلی پھرتی ہیں تو پھریں۔ انھیں جلوسوں میں شریک ہونے دو۔ جھنجھیاں کھانے پر زور زور سے طنبورے بجتے رہیں اور گھڑیالوں سے نفسانی چاؤ کے احتشام کی منادی ہوتی رہے اور (یہ نکتہ غیر اہم نہیں) ان پر لطف رسوم سے پیدا ہونے والے بچوں کو سب لوگ پیار کریں اور مل کر پالیں پوسیں۔ ایک بات مجھے معلوم ہے، اور وہ یہ کہ اومیلاس میں احساس جرم

سرے سے نہیں۔ لیکن اس کی جگہ وہاں اور کیا ہونا چاہیے؟ پہلے مجھے خیال آیا کہ وہاں سے منشیات کو غائب کر دیا جائے لیکن یہ تو تنگ نظر اخلاقیت ہوتی۔ جن لوگوں کا دل چاہے وہ یہ فرض کر لیں کہ دروز کی بھینی بھینی ہیٹلی مٹھاس سے شہر کے گلی کوچے معطر ہیں، دروز جس کی بدولت ذہن اور اعضا کو پہلے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی لطیف اور براق ہو گئے ہیں اور پھر چند ساعتوں کے بعد ایک خواب آسا آلکسی طاری ہو جاتی ہے اور بالآخر کون و مکاں کے مخفی ترین اسرار اور رموز نہانی کے ہوش ربا جلوے نظر آنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دروز کا یہ خاصہ بھی ہے کہ جنس کی لذت کو ناقابل یقین حد تک ہیجان خیز بنا دیتا ہے۔ لطف یہ کہ دروز ایسی شے نہیں جس کی لت لگ جائے۔ ان لوگوں کے لیے، جن کا ذوق مے نوشی زیادہ سیدھا سادہ ہو، میرے خیال میں بیئر ضرور ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ اس خوش و خرم شہر میں کیا کیا ہونا چاہیے؟ اس کے علاوہ؟ فتح مندی کا احساس، یہ تو لازمی ہے، اور جشن شجاعت بھی۔ لیکن جس طرح ہم نے ملاؤں اور پنڈتوں کے بغیر گزارا کر لیا ہے اسی طرح سپاہیوں کے بغیر بھی کام چلا لینا چاہیے۔ جس خوشی کی بنیاد قتل و غارت پر اٹھائی گئی ہو وہ صحیح طرح کی خوشی نہیں۔ وہ کام نہیں دے گی۔ وہ ڈراؤنی اور پوچ ہوتی ہے۔ ایک ناپیدا کنار اور فراخ دلانہ طمانیت، ایک عالی ظرفانہ احساسِ کامرانی جو کسی بیرونی دشمن کے حوالے سے محسوس نہ کیا جائے بلکہ ہر مقام کے جملہ انسانوں کے انفاس کے نفیس ترین اور حسین ترین جوہر سے اور دنیا کے پرنور موسم گرما کے جاہ و جلال سے نسبت قلبی قائم کرنے سے حاصل ہو: یہی وہ جذبہ ہے جو اہل اومیلاس کے دلوں کو گرمائے رکھتا ہے اور جس فتح کا جشن وہ مناتے ہیں وہ زندگی کی فتح ہے۔ سچ پوچھیے تو میں نہیں سمجھتی کہ ان میں سے بہت سوں کو دروز پینے کی کوئی ضرورت ہے۔

اس وقت تک بیشتر جلوس قطعاتِ سبز پہنچ چکے ہیں۔ نان بائیوں کے سرخ اور نیلے خیموں سے کھانے پکنے کی ایک عجوبہ خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے چپ چپے چہروں پر پیار آتا ہے۔ ایک مرد کی شفیق سفید داڑھی میں نفیس پیسٹری کے دو ایک ریزے اٹکے ہوئے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے گھوڑوں پر چڑھ کر اس لکیر کے پاس جمع ہونے لگے ہیں جہاں سے گھڑ دوڑ شروع ہوگی۔ ایک ٹھگنی ٹاٹھی بڑھیا ہنس ہنس کر ایک چنگیر سے پھول نکال نکال کر بانٹ رہی ہے اور قد آور نوجوان اس کے پھولوں کو اپنے چمکیلے بالوں میں اڑستے جاتے ہیں۔ نو دس برس کا ایک بچہ مجمعے کے عین سرے پر اکیلا بیٹھا مرلی بجا رہا ہے۔ لوگ اس کی مرلی سننے کو ذرا کے ذرا رکتے ہیں، مسکراتے ہیں، لیکن اس سے کلام نہیں کرتے کیوں کہ وہ نہ تو مرلی بجانے سے باز آتا ہے اور نہ کبھی ان کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی کالی آنکھیں پوری طرح دھن کی میٹھی، مہین گرمی میں مست ہیں۔

وہ مرلی بجا چکتا ہے اور آہستہ آہستہ ان ہاتھوں کو جنھوں نے مرلی تھام رکھی ہے نیچے کر لیتا ہے۔

یعنی جیسے یہ چھوٹی سی نجی خاموشی کوئی اشارہ ہو۔ گھڑ دوڑ شروع کرنے کی لکیر کے قریب کی بارگاہ سے اچانک بگل بجتا ہے، جلالی، غمگین، دل دوز۔ گھوڑے اپنی چھریری ٹانگوں پر الف ہو جاتے ہیں اور بعضے جواب میں ہنہناتے ہیں۔ سنجیدہ رُو نوجوان سوار گھوڑوں کی گردنیں تھپکتے ہیں اور انھیں دلاسا دیتے ہیں۔ کان میں کہتے ہیں، ''بس بس میرے دلارے، میری آسا...'' وہ گھڑ دوڑ شروع کرنے کی لکیر کے ساتھ ساتھ صف آرا ہوتے جاتے ہیں۔ ہوا چلتی ہے تو گھڑ دوڑ کے میدان کے آزو بازو جوق در جوق جمع لوگ گھاس اور پھولوں بھرا تختہ معلوم ہوتے ہیں۔ موسم گرما کا تہوار شروع ہو چکا ہے۔

آپ کو یقین آیا؟ آپ کو یہ تہوار، یہ شہر، یہ انبساط قبول ہے؟ نہیں؟ تو پھر مجھے ایک بات اور بتانے دیجیے۔

اومیلاس کی خوش نما پبلک عمارتوں میں سے کسی ایک کے نیچے ایک تہہ خانے میں، یا شاید شہر کی بڑی بڑی حویلیوں میں سے کسی ایک کے سرداب میں، ایک کوٹھڑی ہے۔ اس کوٹھڑی میں کھڑکیاں نہیں ہیں۔ ایک دروازہ ہے جس میں تالا پڑا رہتا ہے۔ تھوڑی سی، وہ بھی اترن جیسی، روشنی سرداب کی پرلی طرف کہیں کسی مکڑی کے جالے لگی کھڑکی سے آ کر گرد آلود انداز میں تختوں کے درمیان کی درزوں سے چھن چھن اندر پہنچتی ہے۔ اس کوٹھڑی کے ایک کونے میں ایک زنگ آلود بالٹی کے پاس اکڑے اور بدبودار سروں والی دو کوچیاں رکھی ہیں۔ ان کے بال آپس میں چپک کر جڑ گئے ہیں۔ کچا فرش چھونے پر قدرے سیلا سیلا معلوم ہوتا ہے کہ تہہ خانوں کی زمین عموماً ایسی ہی ہوتی ہے۔ کوٹھڑی تقریباً تین قدم لمبی اور دو قدم چوڑی ہے — محض کوچیاں رکھنے کا تنگ حجرہ یا بے غوری کا شکار اوزار خانہ۔ کوٹھڑی میں ایک بچہ بیٹھا ہے۔ خدا جانے لڑکا ہے یا لڑکی۔ دیکھنے میں تقریباً چھ سال کا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دس کے لگ بھگ ہے۔ وہ فاتر العقل ہے۔ شاید ایسی ہی پیدا ہوا ہو یا شاید سہمے رہنے، ناقص غذا ملنے اور بے توجہی کی وجہ سے سودائی ہو گیا ہے۔ وہ اس کونے میں جو بالٹی اور کوچیوں سے دور ترین ہے سرنوائے، اکڑوں بیٹھا ناک میں سے چوہے نکالتا رہتا ہے یا کبھی کبھار پاؤں کی انگلیوں یا شرم گاہ کو انگل پچو ٹٹول لیتا ہے۔ اسے کوچیوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اسے بھیانک معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں میچ لیتا ہے لیکن جانتا ہے کہ کوچیاں وہیں کی وہیں کھڑی ہوئی ہیں؛ اور یہ کہ دروازہ مقفل ہے، اور وہاں کوئی نہیں آئے گا۔ دروازہ ہمیشہ مقفل رہتا ہے اور وہاں کوئی بھی نہیں آتا۔ بس اتنا ہے کہ کبھی کبھار — بچے کو وقت یا وقفے کی کوئی سمجھ نہیں — کبھی کبھار دروازہ مہیب انداز میں کھڑ کھڑا کر کھلتا ہے اور کوئی شخص یا کئی آدمی چوکھٹ پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ شاید ان میں سے کوئی اندر بھی آ جائے اور آ کے بچے کے لات رسید کرے تاکہ وہ اٹھ کھڑا ہو۔ باقی لوگ ہرگز جو کبھی قریب آتے ہوں: بس سہمی سہمی، متنفر آنکھوں سے بچے کو گھورتے رہتے ہیں۔ کھانے کا چملا اور پانی کا جگ جلدی جلدی

بھر کر دروازہ مقفل کر دیا جاتا ہے۔ آنکھیں غائب ہو جاتی ہیں۔ دروازے میں کھڑے رہنے والے لوگ تو کبھی کچھ نہیں کہتے مگر بچہ، جو ہمیشہ سے اوزار خانے میں رہتا نہیں آیا اور دھوپ اور اپنی ماں کی آواز کو یاد کر سکتا ہے، بعض دفعہ کہتا ہے، ''میں اچھا بچہ بن جاؤں گا۔ مہربانی کر کے مجھے باہر جانے دو۔ میں اچھا بچہ بن جاؤں گا۔'' وہ کبھی جواب نہیں دیتے۔ بچہ پہلے پہل رات کے وقت مدد کے لیے پکارتا تھا اور زار و قطار روتا تھا مگر اب وہ صرف ''اف ہا... اف ہا...'' جیسی ایک طرح کی چنچناہٹ پر اکتفا کرتا ہے اور اس نے بولنا بہت ہی کم کر دیا ہے۔ وہ اتنا سوکھا سڑا ہے کہ اس کی ٹانگوں پر پنڈلیاں نظر نہیں آتیں۔ اس کا پیٹ ابھرا رہتا ہے۔ وہ روزانہ مکئی کی لپسی کا آدھا پیالہ اور چربی کھا کر گزارا کرتا ہے۔ وہ ننگا ہے۔ چوں کہ وہ ہمیشہ اپنی ہی غلاظت میں بیٹھا رہتا ہے اس لیے اس کے چوتڑ اور رانیں رستے ہوئے پھوڑوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

ان سب کو، اومیلاس کے تمام رہنے والوں کو، پتا ہے کہ وہ وہاں ہے۔ ان میں سے بعض آ کے اسے دیکھ بھی گئے ہیں۔ دوسرے صرف اتنا جاننے پر قانع ہیں کہ وہ وہاں ہے۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ اسے وہیں ہونا چاہیے۔ ان میں سے بعض کو اس کی وجہ معلوم ہے اور بعض کو نہیں معلوم، لیکن اتنا سب کو پتا ہے کہ ان کی شادمانی، ان کے شہر کا حسن، ان کے یارانوں کا تلطف، ان کے بچوں کی صحت، ان کے عالموں کی دانائی، ان کے کاریگروں کی ہنرمندی، حتیٰ کہ ان کی فصلوں کی فراوانی اور ان کے افلاک کے سازگار موسم بھی، کلی طور پر اس بچے کی قبیح نامرادی کے مرہونِ منت ہیں۔

عموماً یہ بات بچوں کو آٹھ سے بارہ برس کی عمر کے درمیان کسی وقت، جب بھی ان میں اسے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جائے، ذہن نشین کرا دی جاتی ہے۔ بچے کو دیکھنے آنے والے زیادہ تر نوجوان ہوتے ہیں، اگرچہ اکثر اوقات کوئی نہ کوئی بڑی عمر کا آدمی بھی بچے کو دیکھنے، یا دوبارہ دیکھنے، آ نکلتا ہے۔ اس معاملے کی اونچ نیچ نوجوان تماشائیوں کو کتنی ہی اچھی طرح کیوں نہ سمجھا بجھا دی گئی ہو، یہ منظر دیکھ کر ان کو ہمیشہ ہی صدمہ پہنچتا ہے اور ان کی طبیعت مالش کرنے لگتی ہے، انھیں گھن آنے لگتی ہے، حالاں کہ ان کا خیال تھا کہ وہ ایسی سب باتوں سے بالاتر ہیں۔ تمام توضیحات کے باوجود انھیں طیش آ جاتا ہے، وہ جھنجھلا اٹھتے ہیں اور خود کو بے بس پاتے ہیں۔ ان کا جی چاہتا ہے کہ وہ بچے کے لیے کچھ کریں لیکن کر کچھ بھی نہیں سکتے۔ اس بچے کو اس بیہودہ جگہ سے نکال کر دن کی روشنی میں لے آنا اور نہلا دھلا اور کھلا پلا کر تسلی تشفی دینا واقعی بڑی نیکی کا کام ہوگا لیکن اگر ایسا کیا گیا تو اومیلاس کی تمام مرفہ الحالی اور حسن اور آنند اسی دن اور اسی گھڑی مرجھا جائے گا اور غارت غول ہو جائے گا۔ شرائط یہی طے پائی ہیں۔ اس اکلوتی، چھوٹی سی بہتری کا حساب اومیلاس کی ہر زندگی کی بھلائی اور رعنائی دے کر چکانا پڑے گا۔ فردِ واحد کو خوشی کا موقع بہم پہنچانے کے لیے ہزاروں کی خوشی کو خاک میں ملانا ہوگا۔ یہ تو سچ مچ ایسا لگے گا جیسے احساسِ جرم کو گھر میں پیٹھنے کی اجازت دے دی

جائے۔

شرطیں کڑی اور مطلق ہیں۔ بچے سے کوئی میٹھا بول بولنے تک کی چھوٹ نہیں۔

نوجوان بچے کو دیکھنے اور اس ہولناک دروغ نما راستی کا سامنا کر چکنے کے بعد اکثر آب دیدہ ہو کر یا، بے شک، طیش کے عالم میں گھر کی راہ لیتے ہیں۔ وہ شاید ہفتوں یا برسوں اس کے بارے میں فکر مند رہتے ہوں لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کی سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ اگر بچے کو رہا کر بھی دیا جائے تو وہ اپنی آزادی سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ بلاشبہ گرمائی اور خوراک میسر آنے سے اسے ایک خفیف سی مبہم لذت نصیب ہو جائے گی لیکن اس کے سوا اور کسی بات کی امید کم ہے۔ اس کے حصے میں اتنی زیادہ رسوائی آ چکی ہے اور وہ اس قدر فاتر العقل ہے کہ حقیقی خوشی سے لطف اندوز ہونے کے قابل نہیں رہا۔ وہ اتنے طویل عرصے خوف زدہ رہ چکا ہے کہ خوف کے شکنجے سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے اطوار اتنے زیادہ بُوش ہیں کہ بھل منسائی کے برتاؤ سے کوئی اثر قبول نہیں کر سکتے۔ سچ یہ ہے کہ اتنی دراز مدت کے بعد وہ ان دیواروں کے بغیر، جو اسے پناہ میں رکھتی ہیں، اس اندھیرے بنا، جس سے اس کی آنکھیں مانوس ہو چکی ہیں، اور اپنے فضلے کے بغیر، جس میں وہ بیٹھا رہتا ہے، غالباً لٹا پٹا محسوس کرے گا۔ جب وہ حقیقت کے دہشت ناک انصاف کو محسوس اور قبول کرنے لگتے ہیں تو اس تلخ بے انصافی پر بہنے والے ان کے آنسو سوکھ جاتے ہیں۔ تاہم ان کے یہی آنسو اور طیش، ان کی فیاضی کی یہ آزمائش اور اپنی بے بسی تسلیم کر لینے کی یہ خو ہی شاید ان کی زندگیوں کے تجمل کا اصل ماخذ ہیں۔ ان کی خوشی کوئی روکھی پھیکی غیر ذمے دارانہ خوشی نہیں؛ وہ جانتے ہیں کہ بچے کی طرح وہ بھی آزاد نہیں۔ انھیں پتا چلتا ہے کہ رحم کھانا کسے کہتے ہیں۔ ان کے فنِ تعمیر کی نجابت، ان کی موسیقی کا سوز و گداز، ان کے علوم کا عمق، یہ سب کچھ اس طفیل ہے کہ وہ بچہ موجود ہے اور لوگ اس کے موجود ہونے کا وقوف رکھتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں سے اتنی نرمی سے جو پیش آتے ہیں تو اس کی وجہ بھی وہی بچہ ہے۔ انھیں پتا ہے کہ اگر وہ نامراد بچہ وہاں اندھیرے میں بیٹھا ناک نہ سڑکتا ہوتا تو یہ دوسرا، مرلی والا بچہ بھی اس وقت، جب موسم گرما کی اولیں صبح کی دھوپ میں نوعمر شہسوار اپنی پوری آن بان سے گھڑ دوڑ کے لیے صف آرا ہو رہے ہوں گے، کوئی مسرت آگیں دھن نہیں بجا سکے گا۔

کیا اب آپ کو ان لوگوں کے ہونے کا یقین آیا؟ کیا اب وہ زیادہ قرین عقل نہیں؟ مگر ایک بات تو رہ ہی گئی، اور وہ بہت ہی ناقابل یقین ہے۔

جو نوخیز لڑکیاں اور لڑکے بچے کو دیکھنے جاتے ہیں، وقتاً فوقتاً ان میں کوئی ایسا بھی نکل آتا ہے جو آنسو بہانے یا تاؤ کھانے کے لیے گھر کا رخ نہیں کرتا، بلکہ سچ پوچھیے تو سرے سے گھر جاتا ہی نہیں۔ کبھی کبھار کوئی نسبتاً بڑی عمر کی عورت یا مرد بھی ایک دو دن چپ چپ رہتا ہے اور پھر گھر چھوڑ جاتا ہے۔ یہ لوگ

نکل کر باہر سڑک پر آجاتے ہیں اور تن تنہا چل پڑتے ہیں۔ وہ چلتے رہتے ہیں اور چلتے چلتے خوبصورت پھاٹکوں سے گزر کر اومیلاس کے شہر ہی سے چلے جاتے ہیں۔ وہ اومیلاس کے کھیتوں کھیتوں گزرتے اپنی راہ لگے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی، مرد ہو یا عورت، لڑکا ہو یا لڑکی، اکیلا ہی ہوتا ہے۔ رات چھا جاتی ہے۔ راہرو کو گاؤں کی گلیوں سے، زرد روشنی بھری کھڑکیوں والے دو رویہ مکانوں کے درمیان سے گزر کر، آگے ہی آگے کھیتوں کے اندھیرے میں جائے بغیر مفر نہیں۔ ہر کوئی اکیلے اکیلے مغرب یا شمال کو، پہاڑوں کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ وہ چلتے رہتے ہیں۔ وہ اومیلاس کو چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ تاریکی میں بڑھے چلے جاتے ہیں اور لوٹ کر نہیں آتے۔ وہ جس جگہ کی طرف جاتے ہیں وہ ہم میں سے بیشتر کے لیے شادمانی کے شہر سے بھی کم قابلِ تصور ہے۔ میں اسے بیان کرنے سے قطعاً قاصر ہوں۔ ممکن ہے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو، لیکن ایسا لگتا ہے کہ انھیں پتا ہوتا ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں، انھیں جو اومیلاس چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

کانٹے والا

اجنبی جب سنسان اسٹیشن پر پہنچا تو اس کا سانس پھول چکا تھا۔ اس کے وزنی سوٹ کیس نے، جسے اٹھا کر لانے پر کوئی شخص آمادہ نظر نہ آیا تھا، اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اس نے رومال سے منھ پونچھا اور آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے ریل کی پٹری کو دیکھنے لگا جو افق کو چھو کر غائب ہوگئی تھی۔ مایوس اور آزردہ ہو کر اس نے اپنی گھڑی دیکھی: ٹھیک وہی وقت تھا جب ٹرین کو روانہ ہونا چاہیے تھا۔

کسی نے، جو نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا، اجنبی کے کندھوں کو آہستہ سے تھپتھپایا۔ اجنبی نے مڑ کر دیکھا تو سامنے ایک منحنی سا بوڑھا نظر آیا جس پر ریلوے کا ملازم ہونے کا کچھ شائبہ گزرتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں سرخ لالٹین اٹھا رکھی تھی، مگر اتنی چھوٹی سی کہ کھلونا معلوم ہوتی تھی۔ اس نے مسکرا مسکرا کر اجنبی کا جائزہ لیا۔ اجنبی نے بوکھلا کر پوچھا:

''معاف کرنا، کیا ٹرین جا چکی؟''

''آپ کو اس ملک میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا؟''

''مجھے فوراً روانہ ہونا ہے۔ مجھے کل ت ــــ پہنچ جانا چاہیے۔''

''میں سمجھ گیا کہ آپ کو مطلق اندازہ نہیں کہ ہو کیا رہا ہے۔ اب چاہیے یہ کہ مسافروں کے لیے جو سرائے ہے آپ فی الفور وہاں جا کر ٹھیرنے کا کوئی بندوبست کر لیں۔'' اور اس نے ایک عجیب وغریب ملگجی عمارت کی طرف اشارہ کیا جو دیکھنے میں جیل خانے سے زیادہ مماثلت رکھتی تھی۔

''لیکن میں تو ٹرین پر جانا چاہتا ہوں، اس ہوٹل میں ٹھیرنا نہیں چاہتا۔''

''فوراً کمرہ کرائے پر لے لیں، بشرطے کہ کوئی کمرہ خالی ہو۔ اگر کمرہ مل جائے تو پورے مہینے کے لیے کرائے پر لے لیں کیوں کہ اس طرح وہ آپ کو سستا پڑے گا اور آپ کی خاطر تواضع بھی خوب کی جائے گی۔''

''تم پاگل ہو گیا؟ مجھے کل صبح لازمی طور پر ت—— پہنچنا ہے۔''

''سچ پوچھیے تو مجھے کیا، آپ سے جو بن پڑے سو کیجیے۔ لیکن میں آپ کو تھوڑی بہت معلومات فراہم کیے دیتا ہوں۔''

''ارشاد...''

''یہ ملک، جیسا کہ آپ کو علم ہے، اپنی ریلوے کے لیے مشہور ہے۔ ابھی ریلوے کے نظام کے مکمل بندوبست کی نوبت تو نہیں آئی لیکن ٹائم ٹیبل چھاپنے اور ٹکٹ جاری کرنے کے سلسلے میں زبردست پیش رفت ہو چکی ہے۔ ریلوے کے ہدایت ناموں میں ملک کے جملہ شہروں کے نام درج ہیں اور ان سب کو آپس میں ملا بھی دیا گیا ہے۔ انتہائی ذرا ذرا سے اور بے حد دور اُفتادہ دیہات تک کے لیے ٹکٹ جاری کر دیے جاتے ہیں۔ اگر ٹرینیں ان فہمائشوں پر عمل کرنے لگیں جو ہدایت ناموں میں درج ہیں، اور مقررہ اسٹیشنوں پر سچ مچ رکنے لگیں، تو جو واحد کمی رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے۔ شہریوں کو امید ہے کہ اَور ترقی ہو گی۔ اس دوران میں وہ ریل کی سروس میں بے قاعدگیوں سے نباہ کیے جاتے ہیں اور ان کی حب الوطنی انھیں کسی اشارے کنائے سے اپنی ناراضگی ظاہر کرنے سے باز رکھتی ہے۔''

''لیکن کیا کوئی ٹرین ایسی بھی ہے جو اس شہر سے گزرتی ہو؟''

''اگر میں کہوں کہ ہاں، تو یہ غلطی کا ارتکاب کرنے کے مترادف ہوگا۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، ریل کی پٹریاں موجود ہیں، اگرچہ ان کی دیکھ بھال پر توجہ ذرا کم ہی دی جاتی ہے۔ بعض شہروں میں تو پٹریوں کے بجائے زمین پر چاک سے صرف دو لکیریں کھینچ دی گئی ہیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر کسی ٹرین کو یہاں سے گزرنے کی ضرورت نہیں، لیکن ایسا امر بھی کوئی نہیں جو اس کے یہاں سے گزرنے کا مانع ہو۔ میں نے اپنی زندگی میں متعدد ٹرینوں کو گزرتے دیکھا ہے اور بعض مسافروں سے مل چکا ہوں جو ٹرین پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر آپ مدت مدید تک انتظار کر لیں تو شاید یہ شرف مجھے حاصل ہو جائے کہ آپ کو کسی دیدہ زیب اور آرام دہ ڈبے میں جگہ دلا دوں۔''

''کیا وہ ٹرین مجھے ت—— پہنچا دے گی؟''

''آپ کیوں مصر ہیں کہ بس ت—— ہی جانا ہے؟ ٹرین میں جگہ مل جائے تو صرف اسی بات سے آپ کی تسلی ہو جانی چاہیے۔ ایک بار آپ کو ٹرین پر سوار ہونے کا موقع مل جائے تو اس کے بعد آپ کی زندگی موثر طور پر کسی نہ کسی ڈگر پر چل نکلے گی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ ڈگر وہ نہیں ہو گی جو ت—— پہنچا سکے۔''

''بھئی میرے پاس ت—— جانے کے لیے دوٹوک ٹکٹ موجود ہے۔ منطقی طور سے مجھے وہیں پہنچایا

جانا چاہیے، ٹھیک ہے نا؟"

"یہ تو ہر کوئی مان لے گا کہ آپ راستی پر ہیں۔ آپ مسافروں والی سرائے میں ان لوگوں سے بات کرلیں جنھوں نے احتیاط کے خیال سے ڈھیروں ٹکٹ خرید رکھے ہیں۔ عام دستور ہے کہ کائیاں مسافر ملک کی ہر جگہ کا ٹکٹ خرید لیتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ٹکٹوں پر بے تحاشا مال دولت خرچ کر چکے ہیں۔"

"میں سمجھتا تھا کہ ت— جانے کے لیے مجھے صرف ایک ٹکٹ کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھو..."

"قومی ریلوے کا اگلا حصہ اس رقم سے تعمیر کیا جائے گا جو صرف ایک آدمی سے وصول ہوئی ہے۔ اس آدمی نے اپنی قارونی دولت ریل کے ایک ایسے طویل روٹ کے دوطرفہ ٹکٹوں پر ٹھکانے لگا دی ہے جس کے منصوبوں کی، جن میں بہت سی بڑی بڑی سرنگیں اور پل شامل ہیں، ابھی کمپنی کے انجینئروں نے منظوری تک نہیں دی۔"

"لیکن جو ٹرین ت— جاتی ہے کیا وہ چلنی شروع ہوگئی؟"

"ایک وہی ٹرین نہیں، حقیقت یہ ہے کہ ملک میں بہت سی ٹرینیں چل رہی ہیں اور مسافر نسبتاً تواتر سے ان پر آجا سکتے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ یہ ٹرین سروس ایسی نہیں جس پر تکیہ کیا جا سکے۔ دوسرے لفظوں میں، ٹرین میں جگہ مل جانے کے بعد کوئی مسافر یہ توقع نہیں کرتا کہ اسے اپنی منزل مقصود پر پہنچا دیا جائے گا۔"

"یہ کیسے؟"

"شہریوں کی خدمت بجالانے کے جذبے کے تحت کمپنی کو مجبوراً جان جوکھوں کی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ وہ ٹرینوں کو ایسی جگہوں پر چلاتی رہتی ہے جو ناقابل گزر ہیں۔ یہ مہماتی ٹرینیں بعض اوقات کئی سال میں اپنا سفر مکمل کر پاتی ہیں اور اس عرصے میں مسافروں کی زندگیوں میں چند ایک اہم تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ ان حالات میں اموات کا واقع ہو جانا اچنبھے کی بات نہیں لیکن کمپنی، جس نے ہر چیز کی پیش بندی کر رکھی ہے، ان ٹرینوں کے ساتھ ایک جھاڑ فانوس والا خانہ گرجا اور ایک ایسا ڈبا لگا دیتی ہے جو قبرستان کا کام دیتا ہے۔ کنڈکٹر فخر محسوس کرتے ہیں اگر انھیں کسی مسافر کی پرتکلف انداز میں حنوط شدہ لاش اُس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اتارنے کا موقع مل جائے جس کا نام مسافر کے ٹکٹ پر درج ہو۔ کبھی کبھار ان ٹرینوں کو ایسے علاقوں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں ایک طرف کی پٹری موجود نہیں ہوتی۔ پہیوں کے سلیپروں سے ٹکراتے رہنے کے باعث ڈبے ایک طرف سے افسوس ناک انداز میں لرزتے رہتے ہیں۔ درجہ اول کے مسافروں کو (یہ ایک اور مثال ہے کہ کمپنی ان کا کتنا لحاظ کرتی ہے) اس طرف

بٹھایا جاتا ہے جدھر پٹری موجود ہوتی ہے۔ دوسرے درجے کے مسافر ان جھٹکوں کو چار و ناچار برداشت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں دونوں طرف کی پٹریاں ندارد ہیں۔ وہاں تمام مسافر یکساں طور پر عذاب جھیلتے ہیں حتیٰ کہ ٹرین بالآخر مکمل طور پر پاش پاش ہو جاتی ہے۔"

"خدا کی پناہ!"

"ارے دیکھیے جی، ف—— نام کا گاؤں آباد ہی ایسے ایک حادثے کی وجہ سے ہوا۔ ٹرین ایک ایسے ناہموار خطے میں پہنچ کر پھنس ہوگئی جسے طے کرنا ممکن نہ تھا۔ ریت سے پہیوں کی اتنی رگڑائی ہوئی کہ وہ دھروں تک گھس پس گئے۔ مسافروں کو ایک دوسرے کی صحبت میں اتنا زیادہ وقت گزارنا پڑا کہ اس بالکل ہیچ پوچ بات چیت سے جو وہ آپس میں کرنے پر مجبور تھے، جگری یارانے قائم ہو گئے۔ ان دوستیوں میں سے بعض دیہی ماحول کی پریم کہانیوں میں تبدیل ہو گئیں اور ان سب باتوں کا نتیجہ ف—— کی صورت میں سامنے آیا، ایک ترقی پذیر قصبہ، نٹ کھٹ بچوں سے معمور جو ٹرین کے زنگ آلود آثار سے کھیلتے رہتے ہیں۔"

"خدایا! میں ایسی مہم جوئیوں کے لیے تیار نہیں ہوں!"

"آپ کو بہادر ہونا چاہیے۔ شاید آپ ہیرو ہی بن جائیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ مسافروں کو جرأت اور ایثار کا مظاہرہ کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ ایک مرتبہ دو سو گمنام مسافروں نے ہماری ریلوے کے وقائع کے شاندار ترین صفحات میں سے ایک صفحہ رقم کیا۔ ہوا یہ کہ ایک ایسے سفر کے دوران میں جو آزمائشی طور پر کیا جا رہا تھا، انجینئر کو بروقت ایک سنگین کوتاہی نظر آ گئی جو ریلوے لائن بنانے والوں سے سرزد ہوئی تھی۔ اس رستے میں ایک بہت عریض قعر واقع تھا جس پر ایک پل ہونا چاہیے تھا مگر بنایا نہیں گیا تھا۔ خیر، انجینئر نے، ٹرین کو الٹے پہیوں واپس لے جانے کے بجائے، مسافروں کے سامنے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی اور انھیں اس قدر محنت مشقت کرنے پر راضی کر لیا جو سفر جاری رکھنے کے لیے ضروری تھی۔ انجینئر کی پر زور رہنمائی میں ٹرین کو پرزہ بہ پرزہ کھول ڈالا گیا اور کندھوں پر اٹھا کر قعر کے پار لے جایا گیا جو، یہ بھی سن لیجیے، ایک اور راز کا حامل تھا—— قعر کی تہہ میں ایک گہرا دریا تھا۔ اس کارنامے کے نتائج اس قدر تسلی بخش ثابت ہوئے کہ ریلوے کی انتظامیہ نے پل تعمیر کرنے کا ارادہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔ اس کے بجائے انتظامیہ نے یہ پسند کیا کہ ان مسافروں کو، جو اس مزید وبال کا سامنا کرنے کی جرأت رکھتے ہوں، کرائے میں پرکشش حد تک رعایت دی جائے۔"

"لیکن مجھے تو کل ت—— پہنچنا ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ مجھے اس بات پر بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ آپ اپنے منصوبے کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ آپ ارادے کے پکے ہیں۔ لیکن سر دست آپ سرائے میں کمرہ لے لیں

اور جو پہلی ٹرین ادھر سے گزرے اس پر سوار ہو جائیں۔ کم از کم سوار ہونے کی کوشش تو کریں — کیوں کہ ہزار آدمی ایسے بھی ہوں گے جو آپ کو اپنا مقصد حاصل کرنے سے باز رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ بات یہ ہے کہ بہت ہی طویل عرصے تک انتظار کرنے سے مسافروں پر جھنجھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے اور جوں ہی کوئی ٹرین آ کر رکتی ہے تو وہ غول در غول سرائے سے نکل پڑتے ہیں اور اسٹیشن پر بچ بچ دھاوا بول دیتے ہیں۔ خوش خلقی اور احتیاط کے ناقابل یقین فقدان کے باعث وہ اکثر اوقات حادثوں کا سبب بن جاتے ہیں۔ ٹرین پر قاعدے قرینے سے سوار ہونے کے بجائے وہ ایک دوسرے کو کچل ڈالتے ہیں، کم از کم ایک دوسرے کو ٹرین پر چڑھنے نہیں دیتے، اور ٹرین ان سب کو پلیٹ فارم پر آپس میں گتھم گتھا چھوڑ کر روانہ ہو جاتی ہے۔ نڈھال اور جھلائے ہوئے مسافر اپنی تعلیم کی کمی کو کوستے ہیں اور اپنا وقت ایک دوسرے کو گالیاں دینے اور دو چار کے ٹکانے میں صرف کر دیتے ہیں۔''

''تو کیا پولیس مداخلت نہیں کرتی؟''

''انھوں نے ہر اسٹیشن پر پولیس کا دستہ تعینات کرنے کی کوشش کی ہے مگر ٹرینوں کی ناگہانی آمد کے پیش نظر اس طرح کا بندوبست بیکار ثابت ہوا ہے اور اس پر خرچ بھی بہت آتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس کے ان افراد نے بہت جلدی یہ ثابت کر دیا کہ انھیں خریدا جا سکتا ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مالدار مسافروں کو تحفظ دیا جائے تا کہ وہ دوسروں سے بالکل الگ ہو کر رخصت ہو سکیں۔ اس خدمت کے بدلے میں مسافر، جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا سب کا سب پولیس والوں کو تھما دیتے تھے۔ پھر ایک قرارداد منظور کی گئی کہ خصوصی اسکول قائم کیے جائیں۔ ان اسکولوں میں مستقبل کے مسافروں کو تمیز داری کا سبق اور واجبی تربیت دی جاتی ہے تا کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگیاں ٹرینوں پر بسر کرنے کے لیے تیار ہو سکیں۔ انھیں ٹرین پر چڑھنے کا صحیح طریقہ سکھایا جاتا ہے، چاہے وہ چل ہی پڑی ہو اور اس کی رفتار میں تیزی آ رہی ہو۔ انھیں ایک قسم کی زرہ بکتر بھی فراہم کی جاتی ہے تا کہ دوسرے مسافر ان کی پسلیاں توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔''

''لیکن ایک بار ٹرین میں جگہ مل جائے تو کیا آدمی نئی مشکلوں سے محفوظ ہو جاتا ہے؟''

''نسبتاً۔ میں صرف اس بات کی سفارش کروں گا کہ آپ اسٹیشنوں پر نظر رکھیں۔ ہو سکتا ہے آپ سمجھیں کہ ت— آ گیا ہے اور اصل میں ہو وہ فریب نظر۔ ان ڈبوں میں، جن میں گنجائش سے زیادہ مسافر ٹھونس دیے گئے ہوں، گزاری جانے والی زندگی میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے کمپنی کو بعض تدابیر کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے اسٹیشن بھی ہیں جو محض واہمہ ہیں۔ انھیں جنگل بیابان کے عین وسط میں تعمیر کیا گیا ہے اور ان پر کسی نہ کسی اہم شہر کا نام درج ہے۔ تھوڑی سی احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو اس چالبازی کو بھانپا جا سکتا ہے۔ یہ اسٹیشن تھیٹر کے لوازمات سے مشابہ ہیں اور جو صورتیں ان کے پیش منظر میں

کھڑی نظر آتی ہیں ان میں برادہ بھرا ہوتا ہے۔ بڑی آسانی سے پتا چل جاتا ہے کہ موسمی شدائد نے ان پتلوں کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایسے بنے ہوتے ہیں جیسے عین مین حقیقی ہوں، اپنے چہروں میں ایک بے کراں اکتاہٹ کے آثار سموئے۔"

"شکر ہے کہ ت — یہاں سے دور نہیں۔"

"لیکن بالفعل ہمارے پاس ایسی ٹرینیں موجود نہیں جو براہ راست وہاں جاتی ہوں۔ تاہم یہ عین ممکن ہے کہ آپ، حسب مراد، کل ہی ت — پہنچ جائیں۔ ریلوے کا نظم ونسق اگرچہ ناقص ہے پھر بھی براہ راست سفر کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ارے ذرا غور فرمایئے، ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں علم ہی نہیں ہوتا کہ ہو کیا رہا ہے۔ وہ ت — جانے کے لیے ٹکٹ خریدتے ہیں۔ کوئی ٹرین ادھر سے گزرتی ہے۔ وہ اس میں بیٹھ جاتے ہیں اور اگلے روز ان کے سننے میں آتا ہے کہ کنڈکٹر اعلان کر رہا ہے۔ 'ت۔ ہم ت پہنچ گئے ہیں۔' کسی پیش بندی کے بغیر مسافر وہاں اتر پڑتے ہیں اور انھیں پتا چلتا ہے کہ وہ واقعی ت — آگئے ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہوگا کہ یہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے میں بھی کچھ کرسکوں؟"

"بالکل کرسکتے ہیں۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ اس سے آپ کا کچھ بھلا ہوگا بھی۔ بہرحال، کوشش شرط ہے۔ یہ مثبت تصور لے کر گاڑی پر سوار ہوجایئے کہ آپ ت — پہنچ جائیں گے۔ دوسرے کسی مسافر سے بات چیت نہ کیجیے۔ وہ سفر کے بارے میں اپنی اپنی کہانیاں سنا کر آپ کی خوش فہمی خاک میں ملاسکتے ہیں، بلکہ ان کی طرف سے آپ کے خلاف مخبری کرنے کی نوبت تک آسکتی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"موجودہ صورت حال کی بدولت ٹرینیں جاسوسوں سے بھری پڑی ہیں۔ ان لوگوں نے، جن میں بیشتر رضا کار ہیں، اپنی زندگیاں کمپنی کے تعمیری جذبے کو ہوا دینے کے لیے وقف کردی ہیں۔ بعض اوقات آدمی کو خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور بس بولتے رہنے کی خاطر باتیں کیے جاتا ہے۔ لیکن یہ جاسوس جملے کے جتنے مطلب بھی نکل سکتے ہوں سب سمجھ جاتے ہیں۔ جملہ چاہے بالکل سادہ ہی ہو، وہ انتہائی معصومانہ بات سے کوئی مجرمانہ رائے اخذ کرسکتے ہیں۔ اگر آپ نے ذرہ برابر بھی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا تو آپ کو بیٹھے بٹھائے حراست میں لے لیا جائے گا اور یا تو آپ کی باقی زندگی جیل کے ڈبے میں کٹے گی یا وہ آپ کو زبردستی کسی ایسے جعلی اسٹیشن پر اتار دیں گے جو کہیں بے نام ونشان ویرانے کے بیچ میں یوں واقع ہوگا جیسے کوئی فراموش چیز۔ پُراعتماد ہو کر سفر کیجیے، خوراک حتی الامکان کم سے کم کھایئے اور جب تک ت — میں کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر نہ آئے پلیٹ فارم پر ہرگز قدم نہ دھریے۔"

''لیکن میں تو ت— میں کسی کو جانتا نہیں۔''

''اس صورت میں دگنی احتیاط برتنی لازم ہے۔ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اثنائے راہ میں آپ کو متعدد ترغیبات سے واسطہ پڑے گا۔ کھڑکیوں سے باہر دیکھنے کی صورت میں آپ فریب نظر میں مبتلا ہونے کا خطرہ مول لیں گے۔ مسافروں کی طبع رسا میں ہر وضع کے واہمے ابھارنے کے لیے کھڑکیوں کی ساخت میں انوکھی کاریگری سے کام لیا گیا ہے۔ جال میں پھنسنے کے لیے کمزور ہونا ضروری نہیں۔ بعض کلیں، جنھیں چالو کرنے کا بندوبست ریل کے انجن میں ہوتا ہے، گھڑ گھڑاہٹ پیدا کرکے اور ہلنے جلنے کا تاثر دے کر، آدمی کو باور کرادیتی ہیں کہ ٹرین چل رہی ہے۔ بہرحال، ٹرین ہفتوں کھڑی رہتی ہے اور اس دوران میں مسافروں کو کھڑکیوں سے دلفریب مناظر گزرتے دکھائی دیتے رہتے ہیں۔''

''اور ان تمام باتوں کی غرض و غایت کیا ہے؟''

''ان تمام باتوں سے کمپنی کا معقول مقصد یہ ہے کہ مسافروں کی تشویش میں کمی کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو یہ احساس ہی نہ ہونے دیا جائے کہ ٹرین حرکت میں نہیں ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ایک ایسی کمپنی کے تصرف میں آنے کے بعد جو ہر لحاظ سے طاقتور ہے، مسافر خود کو پوری طرح اتفاقات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے اور انھیں یہ جاننے کی پروا نہ رہے گی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں یا کہاں سے آرہے ہیں۔''

''اور تم، کیا تم ٹرینوں پر خاصا سفر کر چکے ہو؟''

''میں تو، جناب، صرف ایک کانٹے والا ہوں۔ سچ پوچھیے تو کانٹے والا بھی ایسا جو ریٹائر ہو چکا ہے۔ میں یہاں فقط کبھی کبھار پرانے بھلے وقتوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے آنکلتا ہوں۔ میں نے کبھی سفر نہیں کیا۔ مجھے سفر کرنے کی کوئی آرزو بھی نہیں۔ لیکن مسافر مجھے قصے سناتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ف— نامی قصبے کے علاوہ، جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا، ٹرینوں کی بدولت اور بہت سے قصبے بھی وجود میں آچکے ہیں۔ کبھی کبھی ٹرین کے عملے کو پراسرار احکام موصول ہوتے ہیں۔ وہ مسافروں کو ٹرین سے اتر پڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس موقع پر عموماً یہ بہانہ تراشا جاتا ہے کہ انھیں اتر کر کسی طے شدہ مقام کے فطری حسن سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ ان کے سامنے خوش نما گپھاؤں، آبشاروں یا شہرۂ آفاق کھنڈروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ 'فلاں فلاں غار کی خوبصورتی کو سراہنے کے لیے پندرہ منٹ دیے جاتے ہیں،' کنڈکٹر دوستانہ انداز میں اعلان کرتا ہے۔ جب مسافر ٹرین سے کافی دور نکل جاتے ہیں تو ڈرائیور پوری رفتار سے ٹرین چلا دیتا ہے۔''

''اور وہ مسافر؟''

''وہ کچھ عرصے حواس باختہ ہو کر مارے مارے پھرتے رہتے ہیں لیکن بالآخر متحد ہو کر اپنی نو آبادی

قائم کر لیتے ہیں۔ ٹرینوں کے ان بے موقع اسٹاپوں کے لیے ایسے موزوں مقامات چنے جاتے ہیں جو تمام تمدنی مراکز سے بہت دور مگر فطری وسائل سے بخوبی مالا مال ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کی چیدہ چیدہ ٹولیوں کو ایسی جگہوں پر لا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان ٹولیوں میں عورتوں کی تعداد خاص طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گے کہ اپنی عمر کسی نامعلوم خوش منظر جگہ میں کسی پیاری نوجوان لڑکی کے ساتھ گزاریں؟''

منحنی بوڑھے نے آنکھ ماری اور سراپا بھنبھناہٹ بنا، آنکھوں میں شرارت آمیز چمک لیے، مسکرا مسکرا کر، مسافر کو دیکھتا رہا۔ اسی لمحے دور سے سیٹی کی آواز آئی۔ کانٹے والا، دہشت زدہ ہو کر، اچھل پڑا اور لالٹین سے مہمل اور انمل بے جوڑ اشارے کرنے لگا۔

''کیا یہ ٹرین ہے؟'' مسافر نے دریافت کی۔

بوڑھا پٹری کے ساتھ ساتھ دیوانہ وار دوڑنے لگا۔ جب وہ کچھ دور پہنچ گیا تو مڑا اور بولا:

''قسمت آپ کا ساتھ دے۔ کل آپ اپنے مشہور اسٹیشن پہنچ چکے ہوں گے۔ آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''ژ—'' مسافر نے جواب دیا۔

اسی لمحے منحنی بوڑھا روشن صبح میں اوجھل ہو گیا۔ لیکن اس کی لالٹین کی سرخ لو، پٹریوں کے درمیان لپکتی اور جھکولے کھاتی ہوئی، بے پروائی سے، ٹرین کی طرف بڑھتی گئی۔

پس منظر میں ریل کا انجن کسی پُر شور ورود کی طرح قریب آتا گیا۔

اکوتا گاوا ریونوسوکے

سراب

موسم خزاں میں ایک روز دو پہر کے وقت میں مسٹر کاف کے ساتھ، جو مجھ سے ملنے ٹوکیو سے آئے تھے، سراب دیکھنے گیا۔ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ کوگے نوما کے ساحل پر سراب نظر آیا ہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری ملازمہ ایک کشتی کا الٹا عکس دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ سچ مچ کہہ اٹھی، ''یہ بالکل اسی فوٹو جیسا ہے جو کل پرسوں کے اخبار میں چھپا تھا۔''

ہم نے یہ طے کیا کہ ازومایا ہوٹل کا چکر کاٹ کر جائیں گے اور مسٹر الف کو بھی ساتھ ہو لینے کی دعوت دیتے چلیں گے۔ وہاں باڑ کی دوسری طرف مسٹر الف، حسبِ معمول اپنی سرخ قمیص پہنے، بڑے انہماک سے نل چلانے میں مصروف تھے۔ غالباً دو پہر کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے اپنی ایش (Ash) کی بنی ہوئی چھڑی سے انھیں اشارہ کیا۔

''اس طرف سے گھوم کر آجاؤ۔ اوہ، آپ بھی ہیں!'' انھوں نے ضرور یہ سمجھا کہ مسٹر کاف اور میں ملنے آئے ہیں۔

''ہم سراب دیکھنے باہر نکلے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں چلتے؟''

''کیا کہا تم نے، سراب؟'' مسٹر الف نے قہقہہ لگایا۔ ''ان دنوں، ایسا معلوم ہوتا ہے، سراب کے سوا کوئی موضوعِ گفتگو نہیں رہا۔''

پانچ منٹ بعد ہم مسٹر الف کے ساتھ ریت سے اٹی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ ہماری بائیں طرف ہموار ریتلا ساحل پھیلا چلا گیا تھا جس پر کسی بیل گاڑی کے پہیوں سے بنی دو کالی کالی بدھیاں دور تک اریباں کھنچی ہوئی تھیں۔ اور میں نے ان گہری بدھیوں میں کوئی اجنبی چیز محسوس کی۔ وہ مجھے عبقریت کے امٹ نقوش معلوم ہوئیں۔ یہ تھا وہ گہرا تاثر جو انھوں نے مجھ پر چھوڑا۔

''مجھے ڈر ہے کہ میری طبیعت ابھی اعتدال پر نہیں آئی۔ پہیوں کے نشانوں جیسی چیزیں تک بہ آسانی

مجھ پر غالب آجاتی ہیں۔"

مسٹر الف نے میری بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر تیوری چڑھا لی لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ انھوں نے میری ذہنی کیفیت بھانپ لی ہے۔

جلد ہی ہمارا گزر صنوبروں سے ہوا— پست، مریل سے صنوبر— اور ہم ہی کیچی ندی کے کنارے کنارے چلتے گئے۔ وسیع و عریض ریتلے ساحل سے پرے سمندر گہرا نیلا اور اجلا اجلا چمک رہا تھا لیکن اینوشیما جزیرہ— اپنے مکانوں اور درختوں سمیت— دور افق پر دلگیر دھند لکے میں لپٹا ہوا تھا۔

"نیا زمانہ ہے، ہے نا؟" جب دفعتاً کاف نے یہ کہا تو لمحے بھر کو یہ شائبہ ہوا کہ وہ مسکرایا ہے۔ نیا زمانہ؟ لیکن میں نے فوراً ہی کاف کے نئے زمانے کا پتا لگالیا۔ اس کی مراد ایک جوڑے سے تھی جو سیلانی ریت کو روکنے کی غرض سے لگائی ہوئی بونا بانس کی باڑ کی طرف پیٹھ کیے سمندر کا نظارہ کررہا تھا۔ مرد کو، جس نے ہیٹ اور inverness برساتی پہن رکھی تھی، اس "نئے زمانے" کا جواز قرار دینا مشکل تھا، البتہ عورت— جس کے بال کٹے ہوئے تھے، ہاتھ میں زنانہ چھتری اور پاؤں میں نیچی ایڑی کی جوتیاں تھیں — عین مین نئے زمانے کی تجسیم بنی ہوئی تھی۔

"خوش نظر آتے ہیں۔"

"میں شرط بدتا ہوں کہ آپ ان سے حسد محسوس کررہے ہیں،" مسٹر الف نے کاف کو چھیڑا۔

وہ جوڑا اس جگہ سے جہاں سے ہم سراب دیکھنے والے تھے، کوئی سو گز دور تھا۔ ہم تینوں پیٹ کے بل لیٹ گئے اور ندی کے اس پار ریتلے ساحل سے پرے، جو لُو کے مارے تاؤ کھا رہا تھا، نظر جما دی۔ ریت پر نیلے ربن کی دھاری سے مشابہ کوئی چیز لہرا رہی تھی۔ بلاشبہ سمندر تپتی ہوئی ہوا کو منعکس کررہا تھا۔ اس کے سوا، ساحل پر پڑی ہوئی کشتی کا عکس تو درکنار، کچھ نظر نہ آرہا تھا۔

"کیا اسے سراب کہتے ہو تم؟" کاف نے بظاہر مایوس ہوکر پوچھا۔ اس کی ٹھوڑی پر اب بھی ریت لگی ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت، ساحل پر، کوئی دو سو گز دور، ایک کوا نہ جانے کہاں سے منڈلاتا ہوا آیا، لہراتے ہوئے گہرے نیلے ربن کو چھوتا گزرا اور اڑتا اڑتا آگے نکل گیا۔ جب وہ آگے گیا تو تپتی ہوا کی دھاری پر اس کا معکوس سایہ پڑتا نظر آیا۔

"بھئی، مجھے کہنا ہی پڑے گا کہ ہمیں ایک بہترین قسم کا سراب دیکھنے کا موقع ملا ہے۔"

کاف کے اس فقرے کے ساتھ ہی ہم سب ریت سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اٹھتے ہی ہم نے نئے زمانے کے جوڑے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

میں نے کچھ گڑبڑا کر پیچھے نظر ڈالی۔ وہاں اب بھی، کچھ دیر پہلے کی طرح، وہ دونوں باڑ کی طرف

پیٹھ کیے باتیں کر رہے تھے۔ ہم سب، بالخصوص مسٹر الف، قدرے مایوس ہو کر ہنس پڑے۔

''یہ بات سراب سے زیادہ مشابہ ہے، ہے کہ نہیں؟''

ہماری طرف آنے والا نیا زمانہ، ظاہر ہے، کوئی اور جوڑا تھا۔ بہرحال، مرد کے ہیٹ اور عورت کے کٹے ہوئے بالوں کی وجہ سے اس میں اور دوسرے جوڑے میں مطلق تمیز نہ ہو سکتی تھی۔

''اس سے تو مجھ پر ذرا گھبراہٹ طاری ہو گئی ہے۔''

''حیرت ہے کہ یہ چپ چپاتے ہمارے پاس آ کدھر سے ٹپکے۔''

اسی نوعیت کی باتیں کرتے کرتے ہم اس دفعہ ہی کچی ندی کے ساتھ ساتھ چلنے کی بجائے ریت کا پست تودہ پار کر گئے۔ اس تودے کے ارد گرد بھی، بانس کی باڑ کے پائیں، بونے صنوبروں پر پیلاہٹ چھا رہی تھی۔ جب ہم ان کے پاس سے گذرے تو مسٹر الف جھکے اور انھوں نے ریت سے کوئی چیز اٹھائی۔ وہ ایک چوبی تختی تھی جس پر سیاہ رال کا چوکھٹا بنا ہوا تھا اور کوئی غیر ملکی عبارت لکھی تھی۔

''میں نے کہا، یہ کیا؟ سر۔ ہ۔ تسوجی... انوا... اپریلو... جارو... ۱۹۰۶ء...''

''حیرت ہے۔ دؤو... ماجیستا... ؟ اب یہاں لکھا ہے ۱۹۲۶ء۔''

''میں شرط بدتا ہوں کہ یہ کسی ایسے آدمی کا کتبہ ہے جسے بحری سفر کے دوران میں سپرد آب کیا گیا تھا،'' مسٹر الف نے قیاس دوڑایا۔

''لیکن کیا سمندر پر سپرد آب کرتے وقت میت کو بالعموم صرف بادبانی کپڑے یا اسی قسم کی چیز میں لپیٹ نہیں دیتے؟''

''بالکل درست۔ اور اس پر وہ یہ تختی لگا دیتے ہیں۔ دیکھو اس میں میخ ٹھکی ہوئی تھی۔ اصل میں یہ ضرور کسی صلیب کا حصہ ہوگی۔''

ہم اب بظاہر بنگلوں کے گرد کھنچی بانس کی باڑوں کے ساتھ ساتھ صنوبروں کے ایک جھنڈ سے گزر رہے تھے۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ مسٹر الف کا قیاس چوبی تختی کی بہترین شرح ہے۔ مجھے دھوپ تک میں بھیانک پن نظر آنے لگا، کوئی ایسی چیز جو ناقابل تشریح تھی۔

''تم نے بھی کیا منحوس شے اٹھالی ہے، واقعی۔''

''کیا؟ میں تو اسے بابرکت چیز سمجھ کر اپنے پاس رکھوں گا۔ لیکن ۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۶ء تک۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کوئی بیس برس کا ہو کر مر گیا۔ کوئی بیس برس کا!''

''میں حیران ہوں آیا وہ مرد تھا یا عورت تھی۔''

''خیر۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن تمھیں پتا ہے کہ یہ شخص عین ممکن ہے کوئی یوریشین ہو۔''

میں نے، یہ تصور کرتے ہوئے کہ وہ ایک یوریشین نوجوان تھا جس نے سمندر پر وفات پائی تھی، کاف کو جواب دیا۔ میں نے یہ بھی طے کرلیا کہ اس کی ماں جاپانی تھی۔

''سراب؟'' مسٹر الف نے، بدستور بالکل سامنے دیکھتے ہوئے، یک لخت اپنے آپ سے کہا۔ ان کی یہ بات سراسر انمل بے جوڑ تھی جس میں کسی قسم کا اشارہ پنہاں نہ تھا، لیکن اس نے ذہن میں کسی چیز کو چھوا۔

''کیا ہم ایک پیالی کالی چائے پینے کے لیے رکیں؟''

ہم ایک بہت گنجان آباد مرکزی سڑک کے نکڑ پر کھڑے تھے۔ گنجان آباد؟ لیکن خشک ریتلی سڑک تقریباً سونی پڑی تھی۔

''تمھارا کیا خیال ہے، کاف؟''

''جو تمھاری مرضی۔''

ٹھیک اسی وقت میں نے دیکھا کہ ایک برف کے گالے جیسا کتا دم دبائے ہماری طرف چلا آرہا ہے۔

۲

کاف کے ٹوکیو چلے جانے کے بعد مسٹر الف، میری بیوی اور میں دوبارہ باہر نکلے اور ہم نے ہی کیجی ندی کا پل پار کیا۔ شام کے تقریباً سات بجے تھے۔ ہم ابھی ابھی کھانا کھا کر اٹھے تھے۔

اس شام ستارے تک نظر نہ آرہے تھے۔ کم کم گفتگو کرتے ہوئے ہم سنسان ساحل پر ٹہلتے رہے۔ اور ساحل پر، ہی کیجی ندی کے دہانے کے پاس، ایک روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ غالباً وہ ان کشتیوں کے لیے خشکی کی علامت کا کام دے رہی تھی جو مچھلیاں پکڑنے سمندر پر نکلی ہوئی تھیں۔

لہروں کا شور لگاتار سنائی دے رہا تھا۔ جب ہم پانی کے کنارے پہنچے تو سمندر کی بو زیادہ کھاری ہو گئی۔ یہ بو خود سمندر سے نہیں بلکہ یوں کہیے کہ سمندری گھاس پھوس اور سمندر میں بہہ کر آنے والی گلی سڑی دلدلی لکڑیوں سے آرہی تھی۔ کسی وجہ سے اس بو نے میرے نتھنوں اور میری کھال کو یکساں طور پر ستایا۔

ہم کچھ دیر پانی کے پاس کھڑے لہروں کی جھجھماتی چوٹیاں دیکھتے رہے۔ چاروں طرف کالا سیاہ سمندر ہی سمندر تھا۔ مجھے کازوسا ساحل پر اپنا دس برس پہلے کا عارضی قیام اور ایک خاص دوست یاد آیا جو میرے ساتھ ٹھیرا تھا اور جس نے، اپنا کام کرنے کے علاوہ، میرے افسانے ''رتالو کا دلیا'' کے پروف پڑھنے میں میرا ہاتھ بٹایا تھا۔

اس اثنا میں مسٹر الف پانی کے پاس اکڑوں بیٹھ گئے اور ایک دیا سلائی جلانے لگے۔

''تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔ صرف ایک دیا سلائی جلانے سے کم بخت ڈھیروں ہی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔''

انھوں نے، جزوی طور پر میری بیوی کو مخاطب کرتے ہوے، گردن موڑ کر اوپر کو ہماری طرف دیکھا۔ جیسا کہ انھوں نے کہا تھا، ایک دیا سلائی کی روشنی نے بالکل اسی طرح بکھرے ہوے گندہ مُو کوڈیم (۱) اور سراندیپ کی کائی کے درمیان انواع و اقسام کے سیپ اجاگر کر دیے۔ جونہی وہ دیا سلائی بجھی انھوں نے ایک اور جلالی، اور لگے کنارے کنارے ٹہلنے۔

''کیسی بھیانک چیز ہے! میں تو سمجھا یہ کسی ڈوبے ہوے مُردے کا پاؤں ہے۔''

وہ غسل کرتے وقت پہننے کا جوتا ثابت ہوا جو آدھا ریت میں دبا ہوا تھا۔ ایک طرف سمندری گھاس کے گچھوں کے بیچ میں اسفنج کا بہت بڑا ٹکڑا پڑا تھا۔ جب دوسری دیا سلائی بجھی تو اندھیرا پہلے سے بھی زیادہ گہرا معلوم ہونے لگا۔

''ویسی تحفہ چیز کوئی نہیں ملی جیسی اب سے پہلے دن میں آپ کے ہاتھ لگی تھی۔''

''تحفہ چیز؟ اوہ تمھارا مطلب ہے وہ چوبی تختی۔ پتا ہے، وہ واقعی غیر معمولی شے ہے۔''

ہم نے طے کیا کہ وسیع ساحل کو، پیچھے لہروں کا شور برابر سنتے ہوے، پار کر کے واپس چلا جائے۔ ہمارے پاؤں بار بار کبھی ریت پر اور کبھی سمندری گھاس پھوس پر پڑتے تھے۔

''یہاں بھی آس پاس شاید ہمیں بہت سی چیزیں مل جائیں۔''

''ایک اور دیا سلائی جلاؤں کیا؟''

''ارے چھوڑیے بھی،'' میں نے کہا۔ ''کیا یہ گھنٹی کی جھنکار نہیں؟''

میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا کیوں کہ میرا خیال تھا کہ شاید یہ بھی ان بہت سے واہموں میں سے ایک ہے جن سے میرا حال ہی میں سابقہ پڑ چکا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ یقیناً کہیں آس پاس کوئی گھنٹی بج رہی ہے۔ میں الف سے دوبارہ پوچھنے ہی والا تھا کہ کیا اسے بھی گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہے، تو میری بیوی، جو ہم سے دو قدم پیچھے تھی، ہنستی ہوئی بولی:

''تمھیں میری کھڑاؤں میں لگی ہوئی گھنٹی کی آواز آ رہی ہے، آ رہی ہے نا؟''

لیکن میں پیچھے مڑے بغیر بتا سکتا تھا کہ اس نے پیال کے بنے ہوے چپل پہن رکھے ہیں۔

---

(۱) Codium – دریائی گیاہ کی ایک قسم – مترجم۔

''سمجھے، آج شام میں نے کھڑاویں پہن رکھی ہیں جس طرح بچپن میں پہنا کرتی تھی۔''

''اوہو! گھنٹی تو ان کی آستین میں بج رہی ہے۔ اب میں سمجھ گیا۔ یہ ننھی بے کا کھلونا ہے۔ وہی سیلولائڈ کا کھلونا جس میں بجنے والی گھنٹی لگی ہوئی ہے۔''

یہ کہہ کر مسٹر الف چپکے چپکے ہنسے۔ میری بیوی قدم بڑھا کر ہم سے آملی اور ہم تینوں شانہ بشانہ چلنے لگے۔ ہمارا آپس میں بات چیت کرنے کا امکان اس کے ٹھٹھول کی وجہ سے بڑھ گیا تھا۔

میں نے الف کو اپنا وہ خواب سنایا جو میں نے گزشتہ شب دیکھا تھا— میں جس میں ایک فیشن ایبل کوٹھی کے آگے کھڑا ایک ٹرک ڈرائیور سے گپ لڑاتا رہا تھا۔ پورے خواب بھر میں سوچتا رہا کہ اس ڈرائیور سے مل چکا ہوں لیکن میری اس کی ملاقات آخر ہوئی کس جگہ تھی، یہ مجھے جاگنے کے بعد بھی پتا نہ چل سکا۔

''پھر یکایک مجھے یاد آیا کہ وہ ایک رپورٹر تھی جو تین یا چار سال پہلے میرا انٹرویو لینے آئی تھی۔''

''تو پھر وہ ڈرائیور عورت تھی؟''

''نہیں۔ تھا تو وہ مرد ہی۔ بس چہرہ اس عورت جیسا تھا۔ کسی چیز کو خواہ ہم صرف ایک ہی بار دیکھیں، وہ پھر بھی ہمارے دماغ میں کہیں نہ کہیں ایسا نقش چھوڑ جائے گی جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔''

''شاید ایسا ہی ہوتا ہو۔ چہرہ تک، اگر وہ خاص طور پر جاذبِ نظر ہو۔''

''مجھے یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ میں نے اس کے چہرے میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی۔ اسی لیے یہ بات اور زیادہ ڈراؤنی سی ہوگئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ڈھیروں ہی چیزیں ہمارے بھی شعور کی دہلیز کے اس پار گھات لگائے بیٹھی رہتی ہیں۔''

''یہ بالکل روشن دیا سلائی جیسا معاملہ ہے، آدمی کو بہت سی چیزیں دکھائی دے جاتی ہیں...''

ان چیزوں کے بارے میں بات چیت کرتے کرتے اتفاقاً میرے مشاہدے میں آیا کہ صرف ہمارے چہرے صاف طور پر نظر آرہے ہیں۔ تاہم پہلے کی طرح اس وقت بھی ستاروں کی روشنی نہ تھی۔ میں پھر بے چینی محسوس کرنے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ میری بیوی نے بھی ضرور یہ محسوس کرلیا ہوگا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے میرے شبہے پر صاد کیا:

''یہ سب ریت کی وجہ سے ہے۔ کیا تمھارے خیال میں ایسا نہیں؟''

اس نے اپنی آستینوں کو ایک ساتھ تھام کر مڑ کر لمبے چوڑے ساحل پر نظر ڈالی۔

''معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''یہ ریت بدبخت تو سچ مچ عملی مذاق کرنے کا عادی ہے۔ سراب بھی اسی کی کارستانی ہے۔ آپ

نے ابھی تک کوئی سراب نہیں دیکھا، مسز ——؟''

''نہیں، میرا خیال نہیں کہ دیکھا ہو۔ بس ابھی کل پرسوں میں نے ایک مرتبہ کوئی نیلی سی چیز دیکھی تھی...''

''بس جو کچھ ہے یہی ہے۔ جو ہم نے آج دیکھا تھا وہ بھی ایسا ہی تھا۔''

ہم نے ہی کچی ندی کا پل پار کیا اور پشتے کی صورت میں بنی ہوئی پکی سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ہوٹل جا پہنچے۔ سارے صنوبروں کی پھننگیں ہوا سے، جو چپ چپاتے چل پڑی تھی، سرسرا رہی تھیں۔ اسی وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک چھوٹے قد کا آدمی تیز تیز قدم اٹھاتا ہماری طرف چلا آرہا ہے، اور مجھے ایک فریب نظر یاد آ گیا جس سے میرا انھی گرمیوں میں ایک شام سابقہ پڑا تھا۔ وہ شام بھی آج ہی کی شام سے مشابہ تھی، اور کاغذ کے ایک ٹکڑے نے، جو حور کے پیڑ میں اٹکا ہوا تھا، کسی طرح ایک خود کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لیکن یہ آدمی کوئی فریب نظر نہ تھا۔ جب ہم ایک دوسرے کے قریب آئے تو مجھے اس کی سفید قمیص کا سامنے کا حصہ نظر آنے لگا۔

''حیرت ہے، یہ کیا چیز ہے؟ میرا مطلب اس شخص کی ٹائی میں لگی ہوئی پن سے ہے۔''

میں نے یہ الفاظ بڑبڑائے ہی تھے کہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ جسے میں اس کی ٹائی میں لگی ہوئی پن سمجھ رہا تھا وہ دراصل اس کے سگریٹ کی لو تھی۔ سب سے پہلے میری بیوی آستین میں منھ چھپا کر دبی دبی آواز میں ہنسی۔ لیکن وہ آدمی ادھر نظر ڈالے بغیر، تیز تیز چلتا ہمارے پاس سے گزر گیا۔

''اچھا تو پھر، شب بخیر۔''

''شب بخیر۔''

ہم بغیر کسی تمہید کے مسٹر الف سے رخصت ہوئے اور صنوبروں میں سائیں سائیں کرتی ہوا کے شور میں چلتے گئے؛ کیڑے مکوڑے مدھم آواز میں جھنگار رہے تھے۔

''ان کی شادی کی سنہری سال گرہ کب ہوگی؟'' میری بیوی کی مراد میرے والد کی شادی کی سال گرہ سے تھی۔

''پتا نہیں کب ہوگی۔ جانی، کیا ہمارے پاس ٹوکیو سے مکھن آ گیا ہے؟''

''مکھن نہیں آیا۔ صرف ساسیج۔''

آخر ہم اپنے گھر کے پھاٹک پر پہنچ گئے۔ پھاٹک جو نیم وا تھا۔

اکوتاگاوا ریونوسوکے

دلدل

ایک بارانی سہ پہر کا ذکر ہے۔ جس جگہ تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی وہاں میں نے ایک کمرے میں ایک روغنی تصویر دریافت کی۔ میرا یہ "دریافت کی" کہنا شاید مبالغہ معلوم ہو لیکن واقعہ دراصل یہی تھا۔ جس تصویر کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ایک کونے میں، جہاں روشنی کا انتظام غیر معمولی طور پر ناقص تھا، کس مپرسی کے عالم میں ٹنگی ہوئی تھی، اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کا چوکھٹا بڑا پھٹیچر تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کا عنوان "دلدل" تھا اور اسے کسی ایسے مصور نے بنایا تھا جس کی مطلق کوئی حیثیت نہ تھی۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ تصویر، جس میں گدلے پانی اور گنجان ہریالی میں الجھی ہوئی میلی زمین کے سوا کچھ نہ دکھایا گیا تھا، ناظرین کے ایک عام مجمعے کو اپنی طرف صرف اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے پر بھی مجبور کر سکتی۔

تاہم یہ بات خاصی عجیب تھی کہ اس مصور نے، اس قدر گنجان ہریالی کا منظر دکھانے میں، سبز رنگ کی رمق تک نہ برتی تھی۔ نرسل، انجیر اور حور کے درخت — ہر شے کو کیچڑ جیسے زرد رنگ میں، سیلے ہوئے پلاستر سے مشابہ زرد رنگ میں جو طبیعت پر گراں گزرتا تھا، بنایا گیا تھا۔ کیا مصور کو ہریالی کا رنگ ایسا ہی نظر آتا تھا؟ یا اس نے ہریالی کی تصویر بناتے وقت کسی وجہ سے غلو کے اس انداز کو ترجیح دی تھی؟ میں، جو اس تصویر کے سامنے کھڑا اس کا نرالا افسوں محسوس کر رہا تھا، حیران ہونے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

لیکن تصویر کو دیکھتے رہنے سے یہ بات بتدریج واضح ہوتی گئی کہ اس میں ایک مہیب طاقت گھات لگائے بیٹھی ہے۔ پس منظر بالخصوص بڑے جاندار انداز میں کھینچا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اتنا جاندار تھا کہ اس پر پاؤں دھرنے کی کیفیت کو تقریباً محسوس کیا جا سکتا تھا: پھسلواں کیچڑ جس پر قدم رکھتے ہی پاؤں ٹخنے تک اندر دھنس جاتا ہے۔ اس چھوٹی سی روغنی تصویر میں مجھے ایک ایسے فن کار کی قابلِ رحم بناوٹی ادا نظر آئی جو فطرت کو اپنی گرفت میں لانے پر تلا ہوا تھا؛ اور اس کی زرد دلدلی ہریالی سے مجھے بہت ارفع وجدان کی کیفیت بہم پہنچی، جیسی آرٹ کے تمام شاندار کارناموں سے بہم پہنچا کرتی ہے۔ وہاں ہر وضع قطع کی تصویریں

نمائش کے لیے موجود تھیں مگر میں نے اور کسی کو اس قدر زوردار نہ پایا۔

''یہ کہتے ہی بنے گی کہ آپ بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔''

اس فقرے پر حیران ہوکر، جسے میرے کندھے کو تھپک کر ادا کیا گیا تھا، میں نے کچھ گڑبڑاتے ہوئے، جلدی سے مڑ کر دیکھا۔

''بھئی، کیا خیال ہے آپ کا اس کے بارے میں؟''

سوال کرنے والے نے، اپنی تازہ تازہ منڈی ہوئی ٹھوڑی سے، بے اعتنائی کے ساتھ دلدلی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آرٹ کا نامہ نگار تھا اور خود کو ماہرِ فن سمجھتا تھا۔ ہٹا کٹا آدمی تھا اور فیشن ایبل کنٹھئ سوٹ ڈانٹے ہوئے تھا۔ ان ناگوار تاثرات کو یاد کرتے ہوئے جو ایک یا دوبار مجھے اس آدمی کی طرف سے ملے تھے، میں نے خاصی ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا:

''یہ ایک شاہکار ہے۔''

''شاہکار ہے! یہ تو دلچسپ بات ہے۔''

ہنسی کے مارے اس کے پیٹ میں بل پڑے جارہے تھے۔ وہ تماشائی جو پاس کھڑے تصویریں ملاحظہ کررہے تھے، بظاہر اس شور کی وجہ سے متعجب ہوکر جو وہ مچارہا تھا، یکایک ہماری طرف دیکھنے لگے۔ میں اور زیادہ چڑ گیا۔

''یہ دلچسپ بات ہے۔ اجازت دیجیے کہ میں یہ جتادوں کہ یہ تصویر کلب کے کسی باقاعدہ رکن کی بنائی ہوئی نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ شخص اس تصویر کو یہاں پیش کرنے پر اصرار کرتا رہتا تھا اس لیے اس کے پسماندگان نے کسی نہ کسی طرح ججوں کو اس پر راضی کرلیا کہ تصویر اس کونے میں ٹانگ دی جائے۔''

''پسماندگان نے؟ تو پھر، یہ مصور مرچکا ہے؟''

''ہاں، مرچکا۔ وہ تو زندہ ہوتے ہوئے بھی فی الواقع مردہ ہی تھا۔''

کچھ دیر سے میرا تجسس میری چڑچڑاہٹ پر غالب آتا جارہا تھا۔

''وہ کیسے؟''

''اس کا دماغ کافی عرصے سے خراب تھا۔''

''تمھارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے یہ تصویر بنائی تھی تب بھی؟''

''اور کیا! کسی پاگل کے سوا کون ایسے رنگ برتے گا؟ اس پر بھی آپ اسے شاہکار کہہ رہے ہیں اور عش عش کررہے ہیں۔ اور یہی وہ بات ہے جس پر مجھے واقعی ہنسی آرہی ہے۔''

ہنس مکھ نامہ نگار ایک دفعہ پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ شاید اسے یہ توقع تھی کہ میں اپنی کم علمی پر شرمندہ

ہو جاؤں گا یا وہ مجھے اپنی برتر فنی سوجھ بوجھ سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال، کچھ بھی سہی، اس کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ جوں جوں اس کی روداد میں نے سنی، مجھے یوں لگا کہ میری ساری روح میں مہیب متانت کے احساس سے ملتی جلتی کوئی چیز اہتزاز کی لہر دوڑا رہی ہے۔ ہیبت زدہ ہو کر میں نے دوبارہ اس دلدلی تصویر پر نظر جما دی اور نئے سرے سے اس مختصر کینوس میں ایک ایسے فن کار کی قابل رحم شبیہ کا پتا لگایا جسے ہولناک کرب اور عدم تحفظ کے احساس کا عذاب سہنا پڑا تھا۔

''جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا دماغ چل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی اور توقع کے مطابق مصوری کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ کم از کم اس بات کی داد شاید ہم اسے دے سکتے ہیں۔''

نامہ نگار کے چمکتے ہوئے چہرے پر تقریباً شادماں مسکراہٹ پھیل گئی۔ صرف یہی وہ صلہ تھا جو ہم میں سے ایک کو اس دنیا سے ملا اور اسے پانے کے لیے اسے اپنی جان کی بازی لگانی پڑی تھی۔ ایک عجیب کپکپاہٹ کے ساتھ، جو میرے جسم میں ہلچل مچاتی دوڑ رہی تھی، میں نے تیسری بار اس سوگوار تصویر میں جھانکا۔ وہاں تاریک ہوتے آسمان اور پانی کے درمیان نرسل، انجیر اور حور کے درخت کھڑے تھے۔ سب کے سب نمناک ہلکے بادامی زرد رنگ میں، برہنہ فطرت کی جابرانہ طاقت سے دھڑکتے ہوئے...

''ہاں، یہ ایک شاہکار ہے۔''

میں نے، نامہ نگار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، للکارتے ہوئے دہرایا۔

لکھنے والوں کا تعارف

یوجین باربو (۱۸۹۵ء-۱۹۶۱ء) رومانیہ سے تعلق ہے۔ بنیادی طور پر شاعر اور فلسفی۔

ہیوگوفان ہوفمنسطال (۱۸۷۴ء - ۱۹۲۹ء) آسٹریا سے تعلق ہے۔ شاعر اور ڈراما نگار کے طور پر اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انتخاب میں شامل افسانہ فضا بندی اور شاعرانہ ہنر مندی کا دل فریب نمونہ ہے۔ جزئیات کا انتخاب، منظرکشی، کرداروں کا اضطراب، بے یقینی کا عالم، یہ سب مل کر تحیر اور ہیبت کی فضا قائم کرتے ہیں۔

اِلسے آئخنگر (۱۹۲۱ء-...) جرمن ناول اور افسانہ نگار۔ بطور افسانہ نگار اِلسے کا بڑا نام ہے۔ کافکا اور ورائے واقعیت نگاروں سے بہت متاثر رہی ہے۔ افسانے بالعموم خود کلامی، خواب ناک فضا، غنائیت اور ناقابلِ فہم گردوپیش میں بیگانہ وار جیے جانے کی روداد کا آمیزہ ہیں۔ ان پر مبہم ہونے کا الزام لگا ہے۔ ابہام کے باوجود اسلوب کی صفائی حیرت ناک ہے۔ ''الٹی کہانی'' میں موت اور غم ناکی کے باوجود انبساط کی جو کیفیت ہے وہ تجزیے سے ماورا ہے۔

کاریل چاپیک (۱۸۹۰ء-۱۹۳۸ء) چیکوسلوواکیا سے تعلق ہے۔ ڈراموں، ناولوں اور افسانوں کے لیے مشہور ہے۔ فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ صحافی کے طور پر یورپ بھر میں گھوما پھرا۔ ایک نامور اداکارہ سے شادی ہوئی۔ نمونیے میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ چاپیک کے ڈراموں کی بڑی شہرت ہے لیکن ادب کے ناقدین کی رائے میں اس کے ناول تخلیقی اعتبار سے زیادہ اہم ہیں۔ ایک trilogy کو خصوصیت سے بہت سراہا گیا ہے۔ افسانوں کی فضا اور مزاج کی گونا گونی بھی کم دلچسپ نہیں۔ لطیف طنز کی لہر، جو ''پانچ روٹیاں'' میں بھی نمایاں ہے، افسانوں کو بہت خواندنی بنا دیتی ہے۔

میلووان جیلاس (۱۹۱۱ء - ۱۹۹۵ء) سابقہ یوگوسلاویا کے علاقے مونٹے نیگرو کا رہنے والا تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں نازیوں کے خلاف چھاپا مار لڑائیوں میں حصہ لیا۔ مارشل ٹیٹو کا دوست تھا۔ حکومت کا اہم

عہدے دار بنا۔ لیکن جب اس نے یوگوسلاویا کے اشتراکی نظام پر کڑی نکتہ چینی کی تو اسے جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں رہائی ملی۔ اس نے متعدد افسانے اور ناول لکھے۔ فکشن سے زیادہ شہرت اس کی ان دو کتابوں کے حصہ میں آئی۔ ''نیا طبقہ'' اور ''ستالن سے ملاقاتیں اور باتیں''۔

گریس اوگوٹ (۱۹۳۰ء۔...) کینیا سے تعلق ہے۔ کسی اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ نرس کے طور پر خدمات انجام دیتی رہی۔ انگلستان جا کر بی بی سی کے لیے بھی کام کیا۔ شادی کے بعد کینیا واپس آ گئی۔ شوہر مورخ ہے۔ گریس نے صرف افسانے لکھے ہیں یا بچوں کے لیے کتابیں۔

ناڈین گورڈیمر (۱۹۲۳ء۔...) جنوبی افریقہ کی ناول و افسانہ نگار۔ جنوبی افریقہ کے سابقہ عدم رواداری کے نظام میں سفید فام اقوام کی بالادستی اور سیاہ فام لوگوں کی تہی دستی کی سخت مخالف۔ اس نے اپنے فکشن میں، جذباتیت کے بغیر، بڑی باریکی اور فنکاری سے ملک کی پیچیدہ صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ اسے ۱۹۹۱ء میں ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔

کونستانتن کوافس (۱۸۶۳ء - ۱۹۳۳ء) یونانی شاعر۔ متمول تاجر خاندان سے تعلق تھا۔ جب خاندان کی قسمت نے پلٹا کھایا تو مصر کی تعمیرات عامہ کی وزارت میں ملازم ہو گیا۔ تقریباً تمام عمر اسکندریہ میں بسر کی۔ اس بارے میں عام طور پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ وہ جدید یونانی ادب کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ بظاہر اس نے بس ایک ہی افسانہ لکھا تھا جس کا ترجمہ انتخاب میں شامل ہے۔ یہ آپ بیتی کہانی لکھنے کی کوشش نہیں ہے۔ دکھایا گیا ہے کہ جس آدمی کا تخیل فعال ہو وہ اپنا اور دوسروں کا دل بہلانے کے لیے نجی زندگی کو افسانوی رنگ دینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

لیون ہارڈ فرانک (۱۸۸۲ء - ۱۹۶۱ء) جرمن فکشن نگار۔ اس کا پہلا ناول جو مشہور ہوا ''ڈاکوؤں کا ٹولا'' تھا۔ امن کا داعی تھا اور جنگ کا سخت مخالف۔ پہلی عالمی جنگ میں جرمنی چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ چلا گیا تھا۔ اس نے جنگ کے خلاف ناول بھی لکھا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں جب نازیوں نے اس کی تصانیف کو نذر آتش کیا تو وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ چلا گیا۔ ''کارل اور اینا'' (۱۹۲۶ء) کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔

اُرسلالے گوِن (۱۹۲۹ء-...) امریکی ناول اور افسانہ نگار۔ سائنس فکشن اور fantasy لکھنے کے لیے مشہور۔ لیکن تحریر کی روانی اور فکر کی سنجیدگی نے اس کی تصانیف کو بڑا وقار عطا کیا ہے۔ اس کے ناولوں اور افسانوں میں جن خیالی دنیاؤں کا ذکر ہے ان کی کشیدگیاں اور دبدھے، برنگِ دگر، وہی ہیں جن سے ہم اپنی دنیا میں دوچار رہتے ہیں۔

خوان خوسے ارے اولا (۱۹۱۸ء-...) میکسکو سے تعلق ہے۔ افسانہ نگار اور ڈراما نگار۔ جو افسانہ ترجمہ کیا گیا ہے اسے پڑھ کر طلسمی واقعیت کا خیال آتا ہے۔ معلوم نہیں وہ اس طرز کے موجدوں میں سے ہے یا بعد میں آنے والوں سے متاثر ہوا۔

اکوتاگاوا ریونوسوکے (۱۸۹۲-۱۹۲۷ء) جاپانی فکشن نگار۔ بہت کم مدت صحافت اور معلمی کے متعلق رہا۔ باقی عمر ادب سے سروکار رکھا۔ اس کے فکشن کا اہم حصہ وہ ہے جس میں پرانی جاپانی کہانیوں اور روایتوں کو نفسیاتی بصیرت کے ساتھ نئے سانچوں میں ڈھالا گیا ہے۔ اس کا قصہ "راشومون" بجا طور پر مشہور ہوا۔ اس نے کوئی ڈیڑھ سو افسانے لکھے۔ اسلوب کی شستگی اور شفافی قابلِ ذکر ہے۔ خودکشی کر لی۔

آج کی کتابیں

آئینہ حیرت
اور دوسری تحریریں

سید رفیق حسین

Rs.375

اس نظم میں
میرا جی

Rs. 225



ہندی کہانیاں - ۱
انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

Rs.180

ایرانی کہانیاں
انتخاب اور ترجمہ

نیر مسعود

Rs. 90

ہندی کہانیاں - ۲
انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

Rs.180

نربدا
اور دوسری کہانیاں

اسد محمد خاں

Rs. 180

ہندی کہانیاں - ۳
انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

Rs.180

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام

خالد حسن

Rs.180

عربی کہانیاں
انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

Rs. 180

شب نامہ
اور دوسری نظمیں

ذی شان ساحل

Rs.150

خطِ مرموز
(کہانیاں)

فہمیدہ ریاض

Rs. 100

ای میل
اور دوسری نظمیں

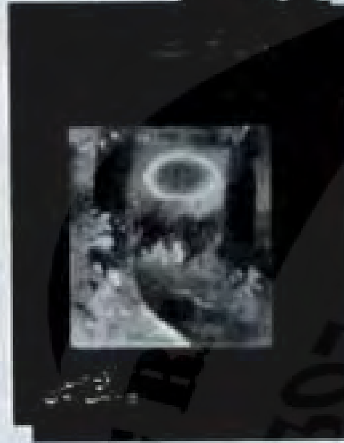
ذی شان ساحل

Rs.150

کہانیاں

لالٹین
اور دوسری کہانیاں
محمد خالد اختر
Rs. 110





سوار
اور دوسرے افسانے
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs. 240

عطرِ کافور
نیر مسعود
Rs. 80

طاؤس چمن کی مینا
نیر مسعود
Rs. 90

عاقبت کا توشہ
نکہت حسن
Rs. 85

دور کی آواز
فیروز مکرجی
Rs. 150

غصے کی نئی فصل
اسد محمد خاں
Rs. 90

ایک اور آدمی
حسن منظر
Rs. 85

صحرا کی شہزادی
سکینہ جلوانہ
Rs. 120

سوئی بھوک
حسن منظر
Rs. 90

خطِ مرموز
(کہانیاں)
فہمیدہ ریاض
Rs. 100

نربدا
اور دوسری کہانیاں
اسد محمد خاں
Rs. 180

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs. 375

ناول

تمس
بھیشم ساہنی
ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی
Rs. 180

قلب ظلمات
جوزف کونریڈ
انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
Rs. 80

دائرہ
محمد عاصم بٹ
Rs. 100

بوف کور
صادق ہدایت
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs. 40

نمبردار کا نیلا
سید محمد اشرف
Rs. 60

بیس سو گیارہ
محمد خالد اختر
Rs. 70

دیمک
شرشیندو مکھوپادھیائے
ترجمہ: رفعت سروش
Rs. 70

پوئین پھر جا پانڈیئڑا
ناول
قرۃ العین حیدر
Rs. 240

گنگا جمنی میدان
اختر حامد خاں
Rs. 120

شخصیات

قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام

ترتیب : خالد حسن

Rs. 180

گردشِ پا

زبیر رضوی

Rs. 70



دیواروں کے باہر

ندا فاضلی

Rs. 100

دیواروں کے بیچ

ندا فاضلی

Rs. 80

میری ناکام زندگی

اختر حامد خاں

Rs. 80

میرا بچپن

عذرا عباس

Rs. 80

نئے خاکے

اختر حامد خاں

Rs. 80

چند بزرگ

اختر حامد خاں

Rs. 80

شاعری

پریم وانی
(گیت، ترجمہ اور فرہنگ)

میرابائی

مرتبہ : سردار جعفری

Rs. 200

آدمی کی زندگی
فہمیدہ ریاض

Rs. 70

کہر آلود آسمان کے ستارے
ذی شان ساحل

Rs. 60

رات
سعیدالدین

Rs. 50

ای میل
اور دوسری نظمیں

ذی شان ساحل

Rs.150



کبیر بانی
(گیت، ترجمہ اور حواشی)

کبیر

مرتبہ : سردار جعفری

Rs. 200

کلیات اختر الایمان
مرتبین : سلطانہ ایمان، بیدار بخت

Rs. 350

کراچی
اور دوسری نظمیں

ذی شان ساحل

Rs. 100

روکو اور دوسری دنیائیں
افضال احمد سید

Rs. 50

شب نامہ
اور دوسری نظمیں

ذی شان ساحل

Rs.150

تنقید و تحقیق

اس نظم میں
میراجی
Rs. 225

مشرق و مغرب کے نغمے
میراجی
Rs. 180

حالی، مقدمہ اور ہم
وارث علوی
Rs. 80

لکھنؤ اور سرشار کی دنیا
فیروز مکرجی
Rs. 100

خندہ ہائے بے جا
وارث علوی
Rs. 100

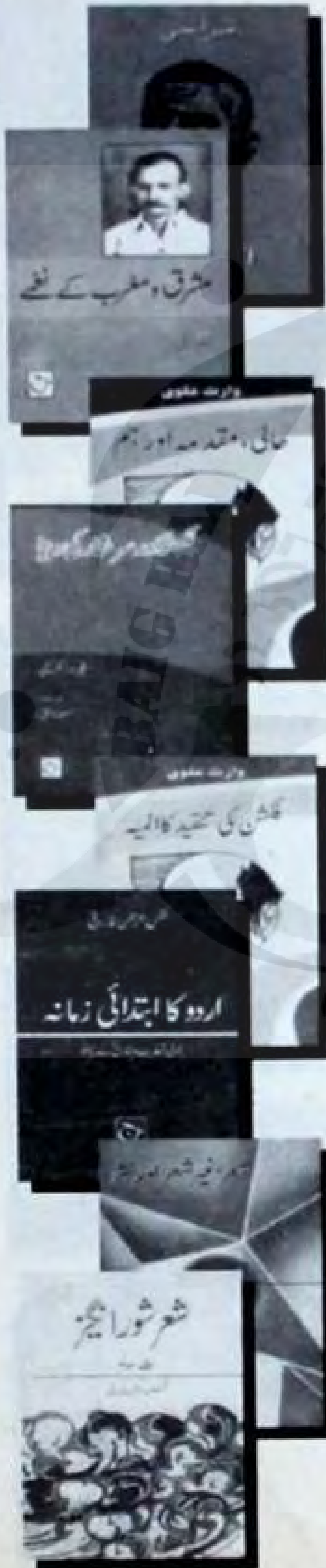
فکشن کی تنقید کا المیہ
وارث علوی
Rs. 80

شعر، غیر شعر اور نثر
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs. 360

اردو کا ابتدائی زمانہ
ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs. 120

ساحری، شاہی، صاحب قرانی
داستان امیر حمزہ کا مطالعہ
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs. 270

شعر شور انگیز
(چار جلدوں میں)
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs. 900



عالمی ادب سے انتخاب

کارل اور اینا

انتخاب اور ترجمہ

محمد سلیم الرحمٰن



Cover painting: **Rabindranath Tagore**

ISBN 969-8379-67-3
Rs.80

